وَقَدْ أَخَذَ مِيثَاقَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ

زیر سرپرستی
مولانا امین احسن اصلاحی

مدیر مسئول
اسرار احمد

ماہنامہ
میثاق
لاہور

جلد ۱۴ | جولائی ۱۹۶۷ء | شمارہ ۱

حُسنِ ترتیب

فَفِرُّوا إِلَى اللّٰہ ! ادارہ ۲
- تذکرہ و تبصرہ ______ اسرار احمد ۳
- تدبر قرآن ______ امین احسن اصلاحی
تفسیر سورہ نساء (۵) ۹
- افادیت فراہیؒ ______ خالد مسعود
اسالیب قرآن (۲) ۲۶
- مقالات ______
تصوف کیا ہے؟ . . . . پروفیسر یوسف سلیم چشتی ۳۵
فلسفہ میں تاریخی نقطہ نظر کے احیاء کی ضرورت . . . . اقبال احمد۔ ایم اے ۴۷

جملہ خط کتابت اور ترسیل زر کے لئے پتہ

دارالاشاعت الاسلامیہ، امرت روڈ کرشن نگر لاہور ۱

قرار داد رحیم آباد

"بسم اللہ الرحمن الرحیم

ہم اس امر پر اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اس نے ہماری راہ کے موانع کو دور فرمایا اور حالات کو اس طرح ساز گار فرمایا کہ ہم ایک بار پھر ایک دوسرے کے نقطہ نظر کو سمجھنے کے لئے ایک مقام پر جمع ہو سکے۔

ہمارے نزدیک یہ بھی اللہ تعالیٰ کا خصوصی فضل و کرم اور انعام و احسان ہے کہ گفت و شنید کے نتیجہ میں ہم نے محسوس کیا کہ بحمد اللہ ہمارے نقطہ نظر اور طرز فکر میں بہت حد تک یکسانی و یکرنگی موجود ہے اور ہم دین کی کسی چھوٹی یا بڑی خدمت کے لئے جمع ہو کر سعی و جہد کر سکتے ہیں۔

بنا بریں ہم یہ طے کرتے ہیں کہ ایک ایسی اجتماعیت کا قیام عمل میں لایا جائے جو دین کے جانب سے عائد کردہ جملہ انفرادی و اجتماعی زمہ داریوں سے عہدہ برا ہونے میں ہماری مدد و معاون ہو۔ جس میں وہ لوگ بھی شریک ہو سکیں جو اپنی زمہ داریوں کی ادائیگی کے لئے جماعت اسلامی میں شامل ہوئے تھے لیکن پھر مختلف مراحل پر اس سے مایوس ہو کر علاحدہ ہوتے چلے گئے اور اب کسی ہیئت اجتماعی میں منسلک نہ ہونے کی بنا پر تشنگی محسوس کر رہے ہیں۔ اور وہ لوگ بھی شریک ہو سکیں جنھیں اپنے دینی فرائض کا احساس ہو جائے اور وہ اپنی اجتماعی زمہ داریوں کی ادائیگی کیلئے کسی اجتماعی نظم میں منسلک ہونا چاہیں۔

ہمارے نزدیک دین کا اصل مخاطب فرد ہے۔ اسی کی اخلاق و روحانی تکمیل اور فلاح و نجات دین کا اصل موضوع ہے اور پیش نظر اجتماعیت اصلاً اسی لئے مطلوب ہے کہ وہ فرد کو اس کے نصب العین یعنی رضائے الٰہی کے حصول میں مدد دے۔

(بقیہ ٹائٹل کے صفحہ ۳ پر)

☐ اس جگہ سرخ نشان کا مطلب یہ ہے کہ اس/گذشتہ شمارے کے ساتھ آپ کا زرمبادلہ ختم ہوچکا ہے ـ آئندہ کے لئے

- ★ سالانہ زرمبادلہ مبلغ ساڑھے سات روپے بذریعہ منی آرڈر ارسال فرمادیں ـــ یا
- ★ اگر آپ کسی وجہ سے خریداری جاری رکھنا نہ چاہیں تو ہمیں مطلع فرمادیں ______ ورنہ
- ★ آئندہ شمارہ آپ کو سالانہ زرمبادلہ اور محصولڈاک کی مالیت کا وی پی ارسال ہوگا اور اس کو وصول کرنے کے آپ اخلاقاً ذمہ دار ہوں گے۔

ففروا الی اللہ!

گذشتہ ماہ اسرائیل کے ہاتھوں مسلمانانِ عرب کو جو ذلت آمیز شکست اٹھانی پڑی اور جس پر پوری دنیا کے مسلمانوں نے اپنے دلوں میں درد کی شدید ٹیسیں محسوس کیں ـــ پھر نام نہاد 'اقوام متحدہ' نے اس معاملے میں سرد مہری ہی نہیں باقاعدہ اسرائیل نوازی کا جو رویّہ اختیار کیا ـــ اس سے کم از کم مسلمانانِ عرب کے لئے تو ایک بار وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ کی وہی کیفیت پیدا ہو گئی جس میں کئی ہزار سال تک بنی اسرائیل مبتلا رہے ہیں ـــ!

اس صورتِ حال کا جتنا ماتم کیا جائے تھوڑا ہے اور 'دیدۂ خون نابہ بار' اس پر جس قدر روئے کم ہے لیکن وَإِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ کے مصداق ماتم کا اصل مقام اور رونے کی اصل جا یہ ہے کہ ذلت اور مسکنت کی اس انتہا کو پہنچ جانے کے بعد بھی رجوع الی اللہ کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی ـــ اور سارا آسرا اور تمام اعتماد حسبِ سابق مادی اسباب و وسائل پر ہے ـــ بلکہ مزید حیران کن امر یہ ہے کہ جن بلوں سے پہلے ڈسے گئے ہیں پوری تیاری اس امر کی ہو رہی ہے کہ پھر انہی سے ڈسے جائیں اور ساری تباہی و بربادی جن کے ہاتھوں آئی ہے انہی سے 'انصاف' کی بھیک مانگی جائے۔

اصحابِ علم اور اربابِ قلم نے بڑے بڑے مقالوں میں اس صورتِ حال کے اسباب و علل کا تجزیہ کیا ہے۔ اور اصلاحِ احوال کی تجاویز پیش کی ہیں ـــ ہمارے نزدیک اس کا اصل سبب صرف ایک ہے اور وہ ہے 'دین سے بعد' ـــ اور علاج بھی صرف ایک ہے اور وہ ہے تجدیدِ ایمان! ـــ اپنے نام لیواؤں اور ایمان کے مدعیوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ دوسروں سے قدرے مختلف ہوتا ہے۔ ان سے جہاں بھلائی اور دینی و اخروی فوز و فلاح کے عظیم وعدے ہیں وہاں ان کی غلط روی پر پکڑ بھی سخت ہوتی ہے ـــ! کئی ہزار سال سے بنی اسرائیل اس قانونِ الٰہی کی گرفت میں آئے ہوئے تھے تو کونسے تعجب کی بات ہے اگر آج امتِ مسلمہ اس کی زد میں آ گئی۔

کاش کہ مسلمانانِ عالم جان لیں کہ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِيْ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ کے سوا اس صورتِ حال سے خلاصی کی کوئی اور راہ موجود نہیں ہے ـــ!

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تذکرہ و تبصرہ

گذشتہ ماہ کے 'تذکرہ و تبصرہ' میں ہم نے عرض کیا تھا کہ ـــ "اسلام کی بنیاد ایمان پر ہے اور احیائے اسلام کا خواب ایمان کی عمومی تجدید کے بغیر کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گا"۔ اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لئے اوّلین ضرورت اس امر کی ہے کہ ـــ "امت میں تجدیدِ ایمان کی ایک عظیم تحریک برپا ہو اور ایمان نرے اقرار اور محض قال سے بڑھ کر 'حال' کی صورت اختیار کرے"۔ ساتھ ہی یہ بھی عرض کیا گیا تھا کہ اس ضمن میں اوّلین اہمیت چونکہ ملت کے ان ذہین عناصر کو حاصل ہے جو از خود معاشرے کی رہنمائی کے منصب پر فائز اور اجتماعیت کی پوری باگ ڈور پر قابض ہوتے ہیں لہٰذا ـــ "وقت کی اہم ترین ضرورت یہ ہے کہ ایک زبردست علمی تحریک ایسی اٹھے جو سوسائٹی کے اعلیٰ ترین طبقات اور ذہین ترین عناصر کے فکر و نظر میں انقلاب برپا کر دے، اور انہیں مادیت اور الحاد کے اندھیروں سے نکال کر ایمان و یقین کی روشنی میں لے آئے اور خداپرستی و خودشناسی کی دولت سے مالا مال کر دے"۔

آخر میں عرض کیا گیا تھا کہ ـــ "مذکورہ بالا علمی تحریک کے اجراء کے لئے فوری طور پر دو چیزیں لازمی ہیں: ایک یہ کہ عمومی دعوت و تبلیغ کا ایک ایسا ادارہ قائم ہو جو ایک طرف تو عوام کو تجدیدِ ایمان و اصلاحِ اعمال کی دعوت دے اور جو لوگ اس کی جانب متوجہ ہوں ان کی ذہنی و فکری اور اخلاقی و عملی تربیت کا بندوبست کرے اور ساتھ ہی اس علمی کام کی اہمیت ان لوگوں پر واضح کرے جو خلوص اور دردمندی کے ساتھ اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے آرزومند ہیں اور دوسری طرف ایسے ذہین نوجوانوں کو تلاش کرے جو پیشِ نظر علمی کام کے لئے زندگیاں وقف کرنے کو تیار ہوں...... دوسرے یہ کہ ایک قرآن اکیڈمی کا قیام عمل میں لایا جائے ـــ جو ایک طرف علومِ قرآنی کی عمومی نشر و اشاعت کا بندوبست کرے تاکہ قرآن کا نور عام ہو اور اس کی عظمت لوگوں پر آشکارا ہو اور دوسری طرف ایسے نوجوانوں کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کرے جو بیک وقت علومِ جدیدہ سے بھی بہرہ ور ہوں اور قرآن کے علم و حکمت سے بھی براہِ راست آگاہ ہوں تاکہ مذکورہ بالا علمی کاموں کے لئے راہ ہموار ہو سکے...."!

راقم الحروف کے ذہن پر اولین اثرات اگرچہ تحریکِ مسلم لیگ کے تھے جن کو علامہ اقبال کی ملّی شاعری اور حفیظ کے شاہناموں سے تقویت حاصل ہوئی تھی لیکن واقعہ یہ ہے کہ شعور کی آنکھ اس نے جماعت اسلامی کی گود ہی میں کھولی ــــ چنانچہ 'تحریک جماعت اسلامی' کے مقدمے میں جماعت اسلامی اور اس کے اکابر کے بارے میں جو یہ عرض کیا گیا تھا کہ:

> ...."میں نے جماعت اسلامی کی گود میں آنکھ کھولی ہے اور جس طرح ایک بچہ سب کچھ اپنی ماں سے سیکھتا ہے اسی طرح میں نے ان حضرات کی آنکھوں سے دیکھنا، ان کے کانوں سے سننا، ان کے دماغوں سے سوچنا اور ان کی زبانوں سے بولنا سیکھا ہے"

تو اس میں ہرگز کسی مبالغے کو دخل نہیں ہے ــــ!

اس تحریک میں ابتداءً اصل زور (EMPHASIS) مندرجہ بالا دو کاموں ہی پر تھا اور اگرچہ اس کی دعوت میں ان دو شقوں کے ساتھ کہ:

> (۱) "یہ کہ ہم بندگانِ خدا کو بالعموم اور جو پہلے سے مسلمان ہیں ان کو بالخصوص اللہ کی بندگی کی دعوت دیتے ہیں۔
>
> (۲) یہ کہ جو شخص بھی اسلام قبول کرنے یا اس کو ماننے کا دعویٰ یا اظہار کرے اس کو ہم دعوت دیتے ہیں کہ وہ اپنی زندگی سے منافقت اور تناقض کو خارج کر دے اور جب وہ مسلمان ہے یا بنا ہے تو مخلص مسلمان بنے اور اسلام کے رنگ میں رنگ کر یک رنگ ہو جائے"...

ایک تیسری شق یہ بھی موجود تھی کہ:

> "(۳) یہ کہ زندگی کا نظام جو آج باطل پرستوں اور فساق و فجار کی رہنمائی اور قیادت و فرمانروائی میں چل رہا ہے اور معاملاتِ دنیا کے نظام کی زمام کار جو خدا کے باغیوں کے ہاتھ میں آ گئی ہے، ہم یہ دعوت دیتے ہیں کہ اسے بدلا جائے اور رہنمائی و امامت نظری اور عملی ــ دونوں حیثیتوں سے مومنین و صالحین کے ہاتھ میں منتقل ہو۔"[1]

تاہم چونکہ عملی طریق کار کے ضمن میں یہ تصریح و وضاحت کے ساتھ موجود تھی کہ:

> "...... ناگزیر ہے کہ ابتدا میں ایک ایسی تحریک اٹھے جس کی بنیاد میں وہ نظریۂ حیات، وہ مقصدِ زندگی، وہ معیارِ اخلاق، وہ سیرت و کردار ہو جو اسلام کے

---

[1] ماخوذ از 'دعوت اسلامی اور اس کے مطالبات' تقریر مولانا مودودی

> مزاج سے مناسبت رکھتا ہو۔ اس کے لیڈر اور کارکن صرف وہی لوگ ہوں جو اس خاص طرز کی انسانیت کے سانچے میں ڈھلنے کے لئے مستعد ہوں پھر وہ اپنی جدوجہد سے سوسائٹی میں اسی ذہنیت اور اسی اخلاقی روح کو پھیلانے کی کوشش کریں پھر اسی بنیاد پر تعلیم و تربیت کا ایک نیا نظام لے کر اٹھے جو اس مخصوص ٹائپ کے آدمی تیار کرے، اس سے مسلم سائنٹسٹ، مسلم فلسفی، مسلم مورخ، مسلم ماہرین سیاست ــ غرض ہر شعبۂ علم و فن میں ایسے آدمی پیدا ہوں جو اپنی نظر و فکر کے اعتبار سے مسلم ہوں جن میں یہ قابلیت ہو کہ دنیا کے خدا ناشناس ائمۂ فکر کے مقابلے میں اپنی عقلی و ذہنی قیادت INTELLECTUAL LEADERSHIP کا سکہ جما دیں ......" (اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے)

لہٰذا ظاہر ہے کہ 'انقلاب امامت' کے ضمن میں بھی اولین اور ناگزیر اہمیت اسی کو دی گئی تھی کہ "عقلی و ذہنی قیادت" کے میدان میں اسلام کا سکہ جما دیا جائے۔

لیکن افسوس کہ ۱۹۴۷ء میں آزادی و تقسیم ہند کے موقع پر حالات و مواقع کے "دام ہم رنگ زمین" نے اس تحریک کی تمام بلند پروازیوں کو ختم کر کے رکھ دیا اور اس کے نتیجے میں جہاں اسے ایک 'بین الاقوامی اصولی اسلامی جماعت' کے مقام سے گر کر 'خالص قومی سیاسی جماعت' کے مرتبے تک آنا پڑا، وہاں ذہنی، فکری اور علمی انقلاب کا سارا پروگرام بھی سیاسی نعرے بازی کے نذر ہو کر رہ گیا۔ ایک غلط موڑ مڑنے کے بعد اس تحریک میں یہ عظیم انقلاب تدریجاً کس طرح رونما ہوا؟ یہ ایک طویل موضوع ہے اور ہم نے اپنے فہم کے مطابق اس پر اپنے اس بیان میں مفصل بحث کی ہے جو ۱۹۵۶ء میں جائزہ کمیٹی کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا اور دس سال بعد ۱۹۶۶ء میں 'تحریک جماعت اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ' کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوا۔

جماعت کے بہت سے سوچنے سمجھنے والے لوگوں نے اس تبدیلی کو شدت کے ساتھ محسوس کیا اور جماعت کے رُخ کو تبدیل کرنے کی کوشش کی اور خالص جمہوری خطوط پر اس تبدیلی کے آثار پیدا ہو بھی گئے لیکن فوراً ایک شدید غیر جمہوری بلکہ آمرانہ ردِّ عمل اس پر حملہ آور ہوا اور اصلاحِ احوال کے تمام دروازے بند ہو کر رہ گئے۔ نتیجۃً وہ لوگ جو جماعت کی پالیسی میں تبدیلی کے خواہشمند تھے ایک ایک کر کے جماعت سے علیحدہ ہوتے چلے گئے ــــ یہ لوگ جماعت سے علیحدگی پر کیوں مجبور ہوتے؟ ــــ اور ان کے علیحدہ ہو جانے کے بعد جماعت

نے تیزی کے ساتھ کیا رنگ اختیار کیا؟ یہ بجائے خود ایک مستقل موضوع ہے جس پر تفصیل سے گفتگو کی ضرورت ہے ـــــ جس کی ابتدا 'میثاق' کے صفحات میں 'تحریک جماعت اسلامی حصہ دوم' کے باب اوّل یعنی 'نقض غزل' کی صورت میں ہو چکی ہے۔!

جماعت سے علیحدہ ہونے والے لوگوں میں علیحدگی کے فوراً بعد یہ احساس شدت کے ساتھ پیدا ہوا کہ انہیں از سرِ نو ایک اجتماعیت میں منسلک ہو کر اسی کام کو شروع کر دینا چاہیے جس کے لئے وہ جماعت میں شامل ہوئے تھے ـــ چنانچہ ۵۸-۱۹۵۷ء میں علیحدہ ہونے والوں کے مابین خاصی گفت و شنید اور باہمی مشاورت اس موضوع پر ہوتی بھی رہی لیکن متعدد وجوہ کی بنا پر اجتماعیتِ جدیدہ کے قیام کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ ان میں سے ایک ـــ اور اہم تر ـــ سبب تو وہ تھا جس کی جانب ہم نے میثاق اگست ۱۹۶۶ء میں اشارہ کیا تھا یعنی یہ کہ:

"اس صورتِ حال کا اصل سبب جماعت اسلامی کا مخصوص تنظیمی ڈھانچہ ہے۔

جماعت کی تنظیم اگرچہ بظاہر "جمہوریت" اور "شورائیت" کی بنیاد پر اٹھائی گئی ہے لیکن واقعتہً اس میں "آزادیٔ رائے" اور اس کے لازمی نتیجے یعنی "اختلاف" کے لئے کوئی واضح اور صحت مند راستے (CHANNELS) موجود نہیں ہیں اور اس کے باوجود کہ اس وقت جماعت اسلامی ملک میں جمہوریت کی سب سے بڑی علمبردار ہے، جماعت کا اپنا نظام اس نہج پر بنا ہے کہ اس میں بس ایک ہی رائے کے پھیلنے اور ایک ہی فکر کے پھلنے پھولنے کا امکان ہے۔ کوئی اختلافی رائے اول تو پیدا ہو ہی نہیں سکتی اگر کسی وجہ سے ہو جائے تو اس کے صحت مند ماحول میں نشوونما پا کر پختگی کو پہنچنے اور جماعت پر اثر انداز ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے۔

جماعت کی سرکاری پالیسی کے متعلق ارکانِ جماعت کی اختلافی گفتگو یہاں ہمیشہ نجویٰ کہلائی جاتی رہی ہے اور تحزبی اختلاف تو بہت دور کی بات ہے، وہ "اختلاف" بھی یہاں سخت خطرناک متصور ہوتا رہا ہے جسے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے "رحمت" قرار دیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ یہاں اختلاف جب بھی ہوا اس نے لازماً ایک دھماکے (EXPLOSION) ہی کی صورت اختیار کی اور اس سے دوہرا نقصان ہوا۔ نہ تو جماعت کے اندر اختلاف "رحمت" بن سکا کہ اس کے ذریعے ذہنوں میں پختگی اور نظر میں وسعت پیدا ہوتی اور مختلف طرز پر سوچنے والے ذہنوں کے غور و فکر اور سعی و جہد اور ان کے باہمی تقابل اور امتزاج سے بہتر اور پختہ تر آراء وجود میں آتیں۔ اختلاف کا اصل جوہر جماعت کے حق میں وہ کام کرتا جو کھاد کھیتی کے لئے کرتی ہے اور اس کے غیر مفید اجزا تقابل کی بھٹی میں ایسے ختم ہو جاتے جیسے دھات سے میل کچیل علیحدہ ہو جاتی ہے ـــ اور نہ ہی ایسا ہو سکا کہ تنظیمی اعتبار سے اختلاف کرنے والوں کی ذہنی ساخت ایسی بنتی کہ وہ بدرجۂ مجبوری اگر جماعت سے علیحدہ ہوتے تو فوری طور پر اپنے نقطۂ نظر کے مطابق اجتماعی جدوجہد میں مصروف ہو جاتے۔

۵۸-۱۹۵۷ء میں جماعتِ اسلامی میں جو اختلاف پیدا ہوا، وہ ابتداءً صحیح جمہوری اور شورائی طرز پر جماعت میں ابھرا اور اگر اسے صحیح خطوط پر آگے بڑھنے کی اجازت دی جاتی تو شاید جماعت انتشار سے بھی بچ جاتی اور مختلف نقطہ ہائے نظر کے لوگوں کی متفقہ جدوجہد سے مجموعی طور پر جماعت میں زیادہ پختگی اور ہمہ گیریت بھی پیدا ہوتی لیکن اس پر فوراً ہی ایک غیر جمہوری ردِّ عمل حملہ آور ہوا، نتیجۃً پہلے "اشتعال" پھر "انتشار" رونما ہو کر رہا۔

یہاں نہ "اختلاف" کو اتنا وقت ملا کہ وہ کوئی واضح صورت اختیار کرتا، نہ اہلِ اختلاف کے باہمی ربط اور گفت و شنید سے اس کے مختلف پہلو متعین ہوتے اور نہ جماعت سے علیحدگی ایک گروپ کی صورت میں ہوتی بلکہ ایک سخت ہیجان انگیز فضا میں ہر فرد کو محض اپنی صوابدید اور ذاتی رائے کے مطابق اہم فیصلے کرنے پڑے اور نکلنے والے ایک ایک کر کے مختلف اوقات میں علیحدہ ہوتے چلے گئے۔ لہٰذا اس کا کوئی امکان نہ تھا کہ اختلاف کرنے والے لوگ فوری طور پر جمع ہو سکتے چنانچہ جو اختلاف جماعت کے اندر "انتشار" کا سبب بنا تھا وہ باہر آکر بھی کسی مثبت اجتماعی جدوجہد کی صورت اختیار نہ کر سکا۔"

اور دوسرا سبب یہ تھا کہ ایک طویل جدوجہد کا انتہائی مایوس کن نتیجہ دیکھ کر اعصاب پر تھکن طاری ہو گئی تھی اور قلوب و اذہان پر مایوسی کا تسلط ہو گیا تھا اور اب کسی نئی جدوجہد کے لئے اول تو طبیعت آمادہ ہی نہ ہوتی تھی اور ضمیر کے شدید تقاضے سے کوئی آمادگی پیدا ہوتی بھی تھی تو پچھلے تجربے کی بنا پر حزم و احتیاط کے اتنے پہلو سامنے آکھڑے ہوتے تھے کہ کسی اقدام کا امکان ہی باقی نہیں رہتا تھا۔ ممکن ہے کچھ دوسرے اسباب و عوامل بھی ہوں، بہرحال ان سب کا نتیجہ یہ نکلا کہ جماعت سے علیحدہ ہونے والے کسی اجتماعیت میں منسلک نہ ہو سکے۔

اور مختلف لوگوں نے بطور خود انفرادی حیثیت میں جو کام بھی بن پڑے شروع کر دیئے ـــ یہ کام جیسا کہ میثاق اگست ۱۹۶۶ء ہی میں کسی قدر تفصیل سے عرض کیا گیا تھا، اکثر و بیشتر تعلیمی

نوعیت کے تھے۔

اجتماعیت کے قیام سے وقتی طور پر مایوس ہو کر راقم الحروف نے خالص انفرادی حیثیت سے غور کیا تو اسے سب سے اہم کام ذہنی و فکری انقلاب کا نظر آیا چنانچہ اس نے منٹگمری میں ایک ہاسٹل قائم کیا جس کا بنیادی فلسفہ یہ تھا کہ کالجوں کے زیر تعلیم نوجوانوں کو ایک اقامت گاہ میں رکھ کر ان کی دینی تعلیم و تربیت کا اہتمام کیا جائے تاکہ ان کے اذہان پر دین و مذہب کے نقوش مرتسم ہو جائیں۔ اور وہ جدید فلسفہ و فکر کا مطالعہ تنقیدی نگاہ سے کر سکیں ۔۔۔ شاید کہ کچھ ذہین نوجوان ایسے نکل آئیں جو جدید و قدیم دونوں میں بصیرت رکھتے ہوں اور انسانی فکر کے دھارے کا رُخ اسلام کے جانب موڑ سکیں۔

اگرچہ یہ ہاسٹل راقم الحروف کے بعض خانگی حالات اور نقل مکانی کے سبب سے صرف تین سال قائم رہ سکا اور اس سے استفادہ کرنے والے طلبہ کی تعداد بھی بہت قلیل رہی، لیکن اتنا ضرور ہوا کہ اس تجربے سے معلوم ہو گیا کہ کام کا یہ طریقہ بہت مفید ہے اور تعلیم کے میدان میں قدیم و جدید میں امتزاج و تالیف کی جتنی کوششیں کی جا رہی ہیں ان میں سب سے زیادہ موثر اور کامیاب طریقہ غالباً یہی ہے بشرطیکہ دارالاقامہ میں کوئی ایسی جامع علمی شخصیت موجود ہو جو طلبہ کے ذہنوں پر گہرا اثر ڈال سکے۔

تقریباً تین سال تک بعض خانگی حالات و مسائل میں سرگرداں رہنے کے بعد آج سے تقریباً ڈیڑھ سال قبل جب راقم الحروف لاہور منتقل ہوا اور کسی قدر ذہنی سکون میسر آیا تو اس خیال نے ازسرِ نو زور پکڑا جس سے "رہینِ ستم ہائے روزگار" رہنے کے باوجود کلی غفلت کبھی نہ ہو سکی تھی اور وہ آگ ازسرِ نو بھڑک اٹھی جس کی کیفیت علمی تعطل کے اس دور میں بھی یہ رہی تھی کہ "آگ بجھی ہوئی نہ جان، آگ دبی ہوئی سمجھ" ۔۔۔ چنانچہ بیک وقت دو خواہشیں دل میں پیدا ہوئیں۔ ایک یہ کہ جماعت اسلامی سے علیحدہ ہونے والے سابق رفقاء میں سے زیادہ سے زیادہ جتنے لوگ ذہنی یکسوئی اور فکری ہمجہتی کے ساتھ مجتمع ہو سکیں انہیں ایک نظم میں منسلک کیا جائے تاکہ عمومی دعوت و تبلیغ اور اصلاح و تربیت کا وہ کام پھر شروع ہو سکے جس کے لئے جماعت اسلامی قائم ہوئی تھی اور دوسرے یہ کہ علوم قرآنی کی نشر و اشاعت کا وسیع بندوبست کیا جائے تاکہ ذہین نوجوان قرآن حکیم کے جانب متوجہ ہوں اور اس چشمہ علم و حکمت سے سیراب ہو کر اس کی ہدایت و رہنمائی کو خالص علمی انداز میں پیش کر سکیں۔

(باقی صـ ۷۲ پر)

تدبر قرآن

امین احسن اصلاحی

تفسیر سورۂ نساء

(۵)

۲۰۔ آگے کا مضمون آیات ۴۴-۵۷

آیت ۴۳ پر، جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں، اصلاحِ معاشرہ سے متعلق احکام کا باب ختم ہو گیا۔ آگے اس ردِ عمل کا بیان آ رہا ہے جو ان اصلاحات کے مخالفین کی طرف سے ظاہر ہوا اور ساتھ ہی مسلمانوں کو ایک عظیم مملکت کی بشارت سنائی جا رہی ہے جو معاشرہ کے بلوغ اور کمال کا قدرتی نتیجہ ہے۔ مخالفین میں سب سے پہلے یہود کو لیا ہے اس لیے کہ حاملِ کتاب ہونے کی وجہ سے سب سے زیادہ انہی کو ان اصلاحات کا حامی ہونا چاہیئے تھا لیکن بدقسمتی سے سب سے زیادہ مخالفت انہی کی طرف سے ہوئی۔ چنانچہ ان کی مخالفانہ شرارتوں کا ذکر کرنے کے بعد ان کو براہِ راست خطاب کر کے دھمکی دی کہ اے اہل کتاب! اگر تم اس کتاب پر ایمان نہ لائے تو یاد رکھو کہ تمہارے لیے وقت آ گیا ہے کہ اصحاب سبت کی طرح تم پر لعنت کر دی جائے اور تمہارے چہرے مسخ کر دیے جائیں۔

اس کے بعد یہود کے بعض مشرکانہ اعمال و عقاید اور ان کے اس زعم پر ان کو سرزنش کی ہے کہ یہ اپنے آپ کو ایک برگزیدہ امت سمجھے بیٹھے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ان کے عقاید و اعمال خواہ کچھ ہوں، یہ چونکہ خدا کے محبوبوں کی اولاد ہیں اس وجہ سے بغیر کسی حساب کتاب کے جنت میں جا براجیں گے۔ فرمایا کہ ان کے اس زعمِ باطل نے جو سرتاسر اللہ پر افترا ہے، ان کو ایمان و عمل کی ذمہ داریوں سے بالکل بے فکر کر دیا ہے اور انھوں نے اپنے آپ کو بندگی کے دائرے سے نکال کر الوہیت کے دائرہ میں شامل کر دیا ہے۔

اس کے بعد اس بات پر تعجب کا اظہار کیا ہے کہ ایک طرف تو تقدس اور برتری کا یہ ادعا ہے، دوسری طرف ذہنی اور اخلاقی پستی کا یہ حال ہے کہ اہل کتاب ہوتے ہوئے جبت و طاغوت پر ایمان رکھتے ہیں اور مسلمانوں کے خلاف حسد میں ایسے اندھے ہو گئے ہیں کہ کفار و مشرکین تک کو مسلمانوں سے زیادہ ہدایت یافتہ قرار دیتے ہیں۔ فرمایا کہ اگر یہ حسد سے اندھے ہو رہے ہیں تو ہو جائیں اب تو تقدیر الٰہی کا یہ فیصلہ ہو چکا ہے کہ اللہ اولادِ اسمٰعیل کو کتاب و حکمت اور ایک عظیم خلافت کا وارث بنا کے رہے گا۔

اس کے بعد اولادِ اسمٰعیل میں سے جن لوگوں نے یہ دعوت قبول کر لی تھی ان کی حوصلہ افزائی فرمائی اور جو لوگ اس کی مخالفت پر اڑے ہوئے تھے ان کو آخرت کے عذاب کی دھمکی دی ——— اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يَشْتَرُونَ الضَّلٰلَةَ
وَيُرِيدُونَ أَنْ تَضِلُّوا السَّبِيلَ ۝ وَاللّٰهُ أَعْلَمُ بِأَعْدَآئِكُمْ ۚ وَكَفٰى
بِاللّٰهِ وَلِيًّا ۝ وَّكَفٰى بِاللّٰهِ نَصِيرًا ۝ مِنَ الَّذِينَ هَادُوا يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ
عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَيَقُولُونَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَّرَاعِنَا
لَيًّا بِأَلْسِنَتِهِمْ وَطَعْنًا فِي الدِّينِ ۚ وَلَوْ أَنَّهُمْ قَالُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا وَاسْمَعْ
وَانْظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَأَقْوَمَ ۙ وَلٰكِنْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَلَا
يُؤْمِنُونَ إِلَّا قَلِيلًا ۝ يٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوا بِمَا نَزَّلْنَا
مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ مِّنْ قَبْلِ أَنْ نَّطْمِسَ وُجُوهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰٓى أَدْبَارِهَآ
أَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّآ أَصْحٰبَ السَّبْتِ ۚ وَكَانَ أَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُولًا ۝ إِنَّ اللّٰهَ لَا
يَغْفِرُ أَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّشْرِكْ
بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰٓى إِثْمًا عَظِيمًا ۝ أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يُزَكُّونَ أَنْفُسَهُمْ ۚ
بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّي مَنْ يَّشَآءُ وَلَا يُظْلَمُونَ فَتِيلًا ۝ اُنْظُرْ كَيْفَ يَفْتَرُونَ
عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ۚ وَكَفٰى بِهٖٓ إِثْمًا مُّبِينًا ۝ أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا
نَصِيبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُونَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوتِ وَيَقُولُونَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا
هٰٓؤُلَآءِ أَهْدٰى مِنَ الَّذِينَ اٰمَنُوا سَبِيلًا ۝ أُولٰٓئِكَ الَّذِينَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ

وَمَنْ يَّلْعَنِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ نَصِيرًا ۝ أَمْ لَهُمْ نَصِيبٌ مِّنَ الْمُلْكِ
فَإِذًا لَّا يُؤْتُونَ النَّاسَ نَقِيرًا ۝ أَمْ يَحْسُدُونَ النَّاسَ عَلٰى مَآ اٰتٰىهُمُ
اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ إِبْرٰهِيمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰهُمْ
مُّلْكًا عَظِيمًا ۝ فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ بِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ صَدَّ عَنْهُ ۚ وَكَفٰى بِجَهَنَّمَ
سَعِيرًا ۝ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِاٰيٰتِنَا سَوْفَ نُصْلِيهِمْ نَارًا ۚ كُلَّمَا
نَضِجَتْ جُلُودُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُودًا غَيْرَهَا لِيَذُوقُوا الْعَذَابَ ۚ إِنَّ
اللّٰهَ كَانَ عَزِيزًا حَكِيمًا ۝ وَالَّذِينَ اٰمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ
جَنّٰتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ خٰلِدِينَ فِيهَآ أَبَدًا ۚ لَهُمْ فِيهَآ
أَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۙ وَّنُدْخِلُهُمْ ظِلًّا ظَلِيلًا ۝

ترجمہ

کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن کو کتاب الٰہی کا ایک حصہ ملا۔ وہ گمراہی کو ترجیح دیتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ تم بھی راہ کھو بیٹھو! اللہ تمہارے دشمنوں سے خوب واقف ہے اور اللہ کافی ہے حمایت کے لیے اور اللہ کافی ہے مدد کے لیے۔ ۴۵

یہود میں سے ایک گروہ زبان کو توڑ مروڑ کر اور دین پر طعن کرتے ہوئے الفاظ کو ان کے موقع و محل سے ہٹا دیتا ہے اور "سمعنا و عصینا" "اسمع غیر مسمع" اور "راعنا" کہتا ہے۔ اور اگر وہ "سمعنا و اطعنا" "اسمع" اور "انظرنا" کہتے تو یہ ان کے حق میں بہتر ہوتا اور بات برمحل ہوتی لیکن اللہ نے ان کے کفر کے سبب سے ان پر لعنت کر دی ہے اس وجہ سے وہ کم ہی ایمان لاتے ہیں۔ ۴۶

اے وہ لوگو جن کو کتاب دی گئی اس چیز پر ایمان لاؤ جو ہم نے اتاری ہے، ان پیشینگوئیوں کے مطابق جو خود تمہارے پاس موجود ہیں، قبل اس کے کہ ہم چہروں کو بگاڑ دیں اور ان کو ان کے پیچھے کی جانب الٹ دیں یا ان پر بھی اسی طرح لعنت کر دیں جس طرح ہم نے سبت والوں پر لعنت کر دی اور خدا کی بات شدنی ہوتی ہے۔ ۴۷

اللہ اس بات کو نہیں بخشے گا کہ اس کا شریک ٹھہرایا جائے۔ اس کے

سوا جو کچھ ہے اس کو جس کے لیے چاہے گا بخش دے گا اور جو اللہ کا شریک ٹھہراتا ہے وہ ایک بہت بڑے گناہ کا افترا کرتا ہے۔ ذرا ان کو تو دیکھو جو اپنے آپ کو بڑا پاکیزہ ٹھہراتے ہیں! بلکہ اللہ ہی ہے جو پاک کرتا ہے جس کو چاہتا ہے اور ان پر ذرا بھی ظلم نہیں کیا جائے گا۔ دیکھو، یہ اللہ پر کیسا جھوٹ باندھ رہے ہیں اور صریح گناہ ہونے کے لیے تو یہی کافی ہے۔ ۴۸ - ۵۰

ذرا ان کو دیکھو جنھیں کتاب الٰہی کا ایک حصہ ملا۔ یہ جبت اور طاغوت پر عقیدہ رکھتے ہیں اور کافروں کے متعلق کہتے ہیں کہ ایمان والوں سے زیادہ ہدایت پر تو یہ ہیں۔ یہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کر دی ہے اور جن پر اللہ لعنت کر دے تو تم ان کا کوئی مددگار نہیں پا سکتے۔ کیا خدا کے اقتدار میں کچھ ان کا بھی دخل ہے کہ یہ لوگوں کو کچھ بھی دینے کو تیار نہیں؟ کیا یہ لوگوں پر حسد کر رہے ہیں، اس فضل پر جو اللہ نے ان کو بخشا ہے؟ تو ہم نے تو بخش دی آل ابراہیم کو کتاب و حکمت اور ہم نے ان کو ایک عظیم سلطنت بھی بخشی۔ ۵۱ - ۵۴

پس ان میں ایسے بھی ہیں جو اس پر ایمان لائے اور ایسے بھی ہیں جنھوں نے اس سے منہ موڑا۔ ایسوں کے لیے جہنم کی بھڑکتی آگ ہی کافی ہے۔ جن لوگوں نے ہماری آیتوں کا انکار کیا ہم ان کو ایک سخت آگ میں جھونک دیں گے۔ جب جب ان کی کھالیں پک جائیں گی ہم ان کو دوسری کھالیں بدل دیں گے تاکہ یہ عذاب کا مزا خوب چکھیں۔ بے شک اللہ عزیز و حکیم ہے۔ اور جو لوگ ایمان لائے، اور جنھوں نے اچھے عمل کیے ہم ان کو ایسے باغوں میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، اس میں ہمیشہ رہیں گے، اس میں ان کے لیے پاک بیویاں ہوں گی اور ہم ان کو گھنی چھاؤں میں رکھیں گے۔ ۵۵ - ۵۷

۱۲- الفاظ کی تحقیق اور جملوں کی وضاحت

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يَشْتَرُوْنَ الضَّلٰلَةَ وَيُرِيْدُوْنَ

اَنْ تَضِلُّوا السَّبِيْلَ ۝ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاَعْدَآئِكُمْ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَلِيًّا ۡ وَّكَفٰى بِاللّٰهِ نَصِيْرًا (۴۵)

قرآن اور دوسرے آسمانی صحیفوں میں نسبت جزو اور کل کی ہے۔

اَلَمْ تَرَ، کا خطاب، جیسا کہ ہم دوسرے مقام میں لکھ چکے ہیں، عموماً تنبیہ اور اظہار تعجب و افسوس کے لیے آتا ہے۔ یہاں خطاب مسلمانوں سے ہے۔ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ سے مراد یہود ہیں۔ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ پچھلے آسمانی صحیفوں اور قرآن عظیم میں نسبت جزو اور کل کی ہے۔ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی کامل کتاب ہے اور دوسرے آسمانی صحیفے اس کے اجزاء و حصص کی حیثیت رکھتے ہیں، اس وجہ سے جو لوگ اس کتاب کامل کے اجزاء و حصص کے حامل بنائے گئے تھے ان سے سب سے زیادہ توقع اس بات کی ہو سکتی تھی کہ جب یہ کتاب کامل ان کے پاس آئے گی تو وہ اس کا آگے بڑھ کر خیر مقدم کریں گے لیکن ان کا عجیب حال ہے کہ وہ گمراہی کو اس ہدایت پر ترجیح دیتے ہیں اور اس کو قبول کرنا تو الگ رہا، دل و جان سے ان کی کوشش یہ ہے کہ تم بھی اس پائی ہوئی صراط مستقیم کو کھو بیٹھو۔ اوپر آیت ۲۷ میں یہ اشارہ گزر چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ تو اس کتاب کے ذریعے سے پچھلے انبیاء و صالحین کے طریقوں کی طرف رہنمائی فرما رہا ہے لیکن خواہشات نفس کے پیرو یہ کوشش کر رہے ہیں کہ تم راہ حق سے بالکل ہی دور ہٹ جاؤ۔ اب یہ اسی اشارے کی تفصیلات آ رہی ہیں۔

وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاَعْدَآئِكُمْ الآیہ مسلمانوں کے لیے تسکین و تسلی کا جملہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے ان دشمنوں سے بے خبر نہیں ہے، ان سے اور ان کی چالوں اور شرارتوں سے خوب واقف ہے۔ وہ ان کی ہر شرارت کو ناکام بنا دے گا۔ جس کا حامی و ناصر اللہ ہو اس کے لیے اللہ کی حمایت و نصرت کافی ہے۔ پس اپنی راہ پر آگے بڑھے چلو اور اللہ کی کارسازی اور مدد پر بھروسہ رکھو۔

مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَّرَاعِنَا لَيًّۢا بِاَلْسِنَتِهِمْ وَطَعْنًا فِي الدِّيْنِ ۭ وَلَوْ اَنَّهُمْ قَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَاسْمَعْ وَانْظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَقْوَمَ ۙ وَلٰكِنْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا (۴۶)

یہود کی ایک شرارت

اس آیت کے تمام الفاظ سورۂ بقرہ کی تفسیر میں زیر بحث آ چکے ہیں۔ یہ ان شرارتوں کی طرف اجمالاً اشارہ ہے جو یہودی اشرار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو لوگوں کی نگاہوں سے

گرانے اور اسلام کو بے وزن اور حقیر بنانے کے لیے کرتے تھے۔

[illegible]

'سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا'، 'اسمع غیر مسمع'، اور 'راعنا' وغیرہ الفاظ جیسا کہ ہم سورۂ بقرہ کی تفسیر میں واضح کر چکے ہیں، عرب کے مجلسی الفاظ میں سے تھے جو متکلم کی تحسین و قدر افزائی، سامع کے اظہار ذوق و شوق، اور مخاطب کے اعتراف و قبول پر دلیل ہوتے تھے۔ جس طرح ہمارے ہاں کہتے ہیں، بجا ارشاد ہے، سر تسلیم خم ہے۔ سنیے، کیا خوب بات فرمائی ہے۔ نادر نکتہ ہے، مکرر ارشاد ہو، پھر فرمایئے۔ اسی طرح عرب میں بھی مذکورہ الفاظ کلمات رائج تھے۔ یہ الفاظ اصلاً تو اظہارِ تحسین یا اعتراف و قبول کے لیے ہیں لیکن اگر کوئی گروہ شرارت اور بدتمیزی کرنا چاہے تو ذرا زبان کو توڑ مروڑ کر، تلفظ کو بگاڑ کر، یا لب و لہجہ میں ذرا مصنوعی انداز پیدا کر کے بڑی آسانی سے تحسین کو تقبیح اور اعتراف و اقرار کو طنز و استہزا بنا سکتا ہے۔ اس سے متکلم کے وقار کو کوئی نقصان پہنچے یا نہ پہنچے لیکن شرارت پسند اشخاص اس طرح اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کی کوشش کر کے خوش ہو جاتے ہیں۔ اب ان الفاظ کو کسی قدر وضاحت کے ساتھ سمجھ لیجیے۔

سمعنا و اطعنا

'سمعنا و اطعنا' کے لفظی معنی ہیں ہم نے سنا اور اطاعت کی۔ اہلِ عرب یہ اس موقع پر بولتے تھے جب اپنے کسی بڑے، کسی سردار، کسی بادشاہ کے حکم و ارشاد پر اپنی طرف سے امتثال امر کے لیے آمادگی اور مستعدی کا اظہار کرنا چاہتے۔ عربی میں اس کے لیے 'طاعۃ' کا لفظ بھی ہے جو قرآن میں بھی استعمال ہوا ہے۔ یہودی اشرار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجالس میں جاتے تو اپنی سعادت مندی اور وفاداری کی نمائش کے لیے 'سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا' تو بات بات پر کہتے لیکن لب و لہجہ کے تصرف سے اس کو ادا اس طرح کرتے کہ 'اطعنا' کو 'عصینا' بنا لیتے۔ چونکہ دونوں کے حروف ہم آہنگ اور قریب المخرج ہیں اس وجہ سے اس تحریف میں ان کو کامیابی ہو جاتی۔ اس طرح وہ تسلیم و اطاعت کے جملہ کو نافرمانی و سرکشی کے قالب میں ڈھال دیتے اور سمجھنے والے ان کی اس شرارت پر کوئی گرفت بھی نہ کر سکتے اس لئے کہ وہ بڑی آسانی سے یہ بہانہ بنا سکتے تھے کہ ہم نے تو 'سمعنا و اطعنا' کہا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں شریف اور خوددار آدمی بات کو سن اور سمجھ کر بھی خاموشی سے ٹال دینے ہی کو بہتر خیال کرتا ہے۔

اسمع غیر مسمع

'اسمع غیر مسمع' کے لفظی معنی ہیں، سنو وہ بات جو پہلے سنائی نہیں گئی۔ اس فقرے کا اچھا محل یہ ہے کہ مجلس میں متکلم یا خطیب کی کوئی حکیمانہ بات سن کر ایک سامع دوسرے سامع کو متوجہ کرے کہ یہ دانشمندانہ اور حکیمانہ بات سنیئے۔ یہ بات پہلی بار ہمارے کانوں نے سنی ہے، اس سے پہلے یہ بات کبھی ہم نے نہیں سنی۔ ظاہر ہے کہ یہ بات نہ صرف متکلم اور خطیب کی قدردانی کی دلیل ہے بلکہ دوسروں کو اس کی قدردانی کے لیے تشویق و ترغیب بھی ہے لیکن کوئی شخص ہوٹنگ (HOOTING) کے انداز میں باندازِ تمسخر یہی بات کہے تو اس کا یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ ذرا اس کی ناشنیدنی سنو، یہ کیسی بے پر کی اڑا رہا ہے، ایسی بات کاہے کو کبھی کسی نے سنی ہوگی!۔ ظاہر ہے کہ محض انداز اور لب و لہجہ کی تبدیلی نے اس نہایت اعلیٰ فقرے کو طعن و طنز کا ایک زہر آلود نشتر بنا دیا لیکن اس پر بھی کوئی گرفت نہیں ہو سکتی، اس لیے کہ گرفت ہو تو کہنے والا صفائی پیش کر سکتا ہے کہ میں نے تو طنز کے طور پر نہیں بلکہ تحسین کے طور پر کہا ہے۔ چونکہ اس فقرے میں طنز کا پہلو 'غیر مسمع' کے الفاظ سے پیدا ہوتا تھا اس لیے قرآن نے اس کی یہ نوک توڑ دی اور ہدایت کی کہ صرف 'اسمع' کہا جائے۔

راعنا

'راعنا' کے لفظی معنی ہیں، ذرا ہماری رعایت فرمایئے۔ اس لفظ کا اچھا محل استعمال یہ ہے کہ اگر مخاطب نے متکلم کی بات اچھی طرح سنی یا سمجھی نہ ہو تو اس کو دوبارہ متوجہ کرنے کے لیے جس طرح ہمارے ہاں کہتے ہیں، پھر ارشاد ہو، پھر فرمایئے، اسی طرح عربی میں 'راعنا' کہتے ہیں۔ یہ لفظ سامع کے ذوق و شوق اور اس کی رغبت علم کی دلیل ہے۔ لیکن یہودی اشرار 'لی لسان' یعنی زبان کے توڑ مروڑ کے ذریعے سے اس کو بھی طنز کے قالب میں ڈھال لیتے تھے۔ اس کی شکل یہ ہوتی کہ 'راعنا' میں 'ع' کے کسرہ کو ذرا دبا دیجیے تو یہ لفظ 'راعینا' بن جائے گا اور اس کے معنی ہوں گے 'ہمارا چرواہا'۔ قرآن نے یہود کی اس شرارت کی وجہ سے اس لفظ کو سرے سے مسلمانوں کے مجلسی الفاظ ہی سے خارج کر دیا اور اس کی جگہ 'انظرنا' کے استعمال کی ہدایت فرمائی جس کے معنی ہیں ذرا ہمیں مہلت عنایت ہو، ذرا پھر توجہ فرمایئے۔ یعنی مفہوم کے لحاظ سے یہ ٹھیک ٹھیک 'راعنا' کا قائم مقام ہے اور اس میں لہجے کے بگاڑ سے کسی بگاڑ کے پیدا کیے جانے کا کوئی موقع نہیں ہے۔[1]

---

[1] اس لفظ پر آیت ۱۰۴ کے تحت سورۂ بقرہ کی تفسیر میں ہم نے جو کچھ لکھا ہے ایک نظر اس پر بھی ڈال لیجیے۔ وہاں ہم نے اس مجلسی اصلاح کے فوائد پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

آخر میں فرمایا کہ ایک حامل کتاب گروہ ہو کر یہ جسارت اور بدتمیزی جو آخری پیغمبر کے ساتھ یہ لوگ کر رہے ہیں، یہ یونہی نہیں ہے بلکہ یہ اللہ کی لعنت کا نتیجہ ہے جو ان کے کفر کے سبب سے ان پر ہوئی ہے۔ خدا نے ان کو اپنے دروازے سے دھتکار دیا ہے۔ اب مشکل ہی سے ان میں سے کچھ لوگوں کو ایمان کی دولت نصیب ہو گی۔

نبی پر طعن خود دین پر طعن ہے

اس آیت میں ایک اور نکتہ بھی قابل توجہ ہے۔ وہ یہ کہ یہود کی یہ تمام شرارتیں تھیں تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر طنز کی نوعیت کی لیکن قرآن نے ان کو طَعۡنًا فِی الدِّیۡنِ کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے جس سے اس حقیقت کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ نبی درحقیقت مجسمۂ دین اور مظہر شریعت ہوتا ہے اس وجہ سے اس پر طعن خود دین پر طعن ہے۔ اس نکتے پر انشاء اللہ ہم سورۂ حدید کی تفسیر میں بحث کریں گے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ اٰمِنُوۡا بِمَا نَزَّلۡنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَکُمۡ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ نَّطۡمِسَ وُجُوۡهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰۤی اَدۡبَارِهَاۤ اَوۡ نَلۡعَنَهُمۡ کَمَا لَعَنَّاۤ اَصۡحٰبَ السَّبۡتِ ؕ وَکَانَ اَمۡرُ اللّٰهِ مَفۡعُوۡلًا (۴۷)

چہروں کو مسخ کر دینے کی علت

طمس الشئ کے معنی ہیں کسی شے کے آثار و علامات کو مٹا دینا۔ چہروں کو مٹا دینے کے معنی یہ ہیں کہ یہ جو آنکھ، کان، ناک اور منہ کے نشانات ہیں یہ سب مٹا کر برابر کر دیے جائیں اس لیے کہ اللہ نے یہ قوتیں نہایت اعلیٰ مقصد سے بخشی تھیں لیکن جب ان سے وہ کام نہیں لیا گیا جس کے لیے یہ عطا ہوئی تھیں بلکہ اس کے بالکل برعکس یہ سب چیزیں ٹھوکر کھانے کے گڑھے بن کر رہ گئی ہیں تو آخر یہ گڑھے کیوں باقی رکھے جائیں؟ یہ بھر کیوں نہ دیے جائیں؟ یہ ملحوظ رہے کہ سورۂ بقرہ میں ان لوگوں کو صم، بکم، عمی کہا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب سب کچھ رکھتے ہوئے یہ گونگے، بہرے اور اندھے بن چکے ہیں تو یہ اسی کے سزاوار ہیں کہ یہ نشانات بھی مٹا ہی دیے جائیں۔

وُجُوۡهًا کے نکرہ لانے کی بلاغت

وُجُوۡهًا کی تنکیر میں بھی بڑی بلاغت ہے۔ یہ تنکیر نفرت و کراہت کے اظہار کے لیے ہے۔ اوپر والی آیت میں ان پر لعنت کا ذکر ہو چکا ہے۔ اس تنکیر سے اس امر کا اظہار مقصود ہے کہ یہ ملعون چہرے اس قدر قابل نفرت ہیں کہ متکلم تعیین کے ساتھ ان کی طرف اشارہ کرنا بھی پسند نہیں کرتا۔ چنانچہ وجوھھم نہیں کہا بلکہ ان سے منہ پھیر کر وجوھا کہا۔ اسی قسم کی تنکیر اَفَلَا یَتَدَبَّرُوۡنَ الۡقُرۡاٰنَ اَمۡ عَلٰی قُلُوۡبٍ اَقۡفَالُهَا (محمد-۲۴) میں لفظ قلوب میں

بھی ہے۔ اس کی بلاغت پر ہم اس کے محل میں انشاء اللہ بحث کریں گے۔

فَرَدَّهَا عَلٰۤی اَدۡبَارِهَا کا مفہوم

فَنَرُدَّهَا عَلٰۤی اَدۡبَارِهَا اسی اوپر والی بات کی تفصیل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب ان کے چہرے اور گدی میں کوئی فرق ہی نہیں، جس طرح پیچھے کا حصہ چپاٹ ہے اسی طرح عملاً آگے کا حصہ بھی چپاٹ ہی ہے۔ تو یہ آگے کا حصہ بھی پیچھے ہی کی طرف کیوں نہ موڑ دیا جائے!

اصحاب سبت پر لعنت کی وجہ اور اس کے اثرات پر بقرہ کی آیات ۶۵-۶۶ کے تحت مفصل بحث گزر چکی ہے۔

یہود کو آخری دھمکی

یہ آیت یہود کے لیے دعوت کی نہیں بلکہ تہدید و وعید کی آیت ہے۔ دعوت کا ذکر اس میں محض اتمام حجت کے طور پر ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اب یہ آخری موقع ہے کہ تم سنبھلنا چاہو تو سنبھل جاؤ۔ یہ موقع نکل گیا تو پھر یہ کبھی میسر نہ آئے گا۔ بہتر ہے کہ اس کتاب پر ایمان لاؤ جو تمہاری اپنی کتاب کی پیشینگوئیوں کی تصدیق کرتی ہوئی اتری ہے ورنہ یاد رکھو کہ اب تمہارے لیے وہ وقت آ پہنچا ہے کہ تمہارے چہرے بگاڑ دیے جائیں یا تمہارے اوپر بھی اسی طرح کی لعنت کر دی جائے جس طرح کی لعنت سبت والوں پر کر دی گئی کہ وہ ذلیل بندر ہو کر رہ گئے۔

وہ لعنت جس کے یہود مستحق تھے

جنت کی طرح لعنت اور نقمت کے بھی مختلف مدارج ہوتے ہیں۔ یہاں ان کو جس درجے کی لعنت کی دھمکی دی گئی ہے یہ وہ لعنت ہے جس کے فی الواقع وہ اپنی شرارتوں کی وجہ سے مستحق بن چکے تھے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے اس سے کم درجے کی لعنت ان پر کی تو یہ ان کو گویا تھوڑی سی مہلت دی گئی اور ہر مہلت جو کسی قوم کو ملتی ہے اگر وہ اس کی قدر نہیں کرتی تو یہ اس کے اخروی عذاب میں زیادتی کا باعث ہوتی ہے۔

عمل اور سزا میں مشابہت

یہ آیت تلاوت کرتے ہوئے مجھے بار بار یہ خیال ہوتا ہے کہ چہروں کو بگاڑ دینے کی دھمکی ان کو دی گئی اس میں عمل اور سزا کی مشابہت پائی جاتی ہے۔ اوپر والی آیت میں ان کی یہ حرکت جو بیان ہوئی ہے کہ پیغمبر کا مذاق اڑانے کے لیے منہ بنا بنا کر اور لہجے بگاڑ بگاڑ کر الفاظ کو کچھ سے کچھ کر دیتے ہیں اور اس منہ بنانے اور الفاظ کے بگاڑنے کو انہوں نے ہنر سمجھ رکھا ہے اسی کی بنا پر وہ مستحق ہوئے کہ واقعی ان کے چہرے مسخ ہی کر دیے جائیں۔ علیٰ ہذا القیاس جنہوں نے حق سے منہ موڑنے ہی کو شیوہ بنا لیا ہے تو وہ سزاوار ہیں کہ ان کے چہرے پیچھے کی طرف الٹ دیے جائیں۔

"وَكَانَ أَمْرُ اللهِ مَفْعُولًا" میں یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ آدمیوں کے چہروں کو گدیوں کی طرح سپاٹ کر دینا، ان کو الٹ دینا یا ان کو مسخ کر کے بندروں کی شکل کا کر دینا خدا کے لیے کوئی مشکل کام ہے۔ اس کے کسی حکم اور اس کے وقوع میں کوئی فاصلہ نہیں ہے۔ ادھر حکم ہوا ادھر اس کا نتیجہ موجود!

إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ
وَمَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدِ افْتَرَىٰ إِثْمًا عَظِيمًا (۴۸) أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ
يُزَكُّونَ أَنْفُسَهُمْ بَلِ اللَّهُ يُزَكِّي مَنْ يَشَاءُ وَلَا يُظْلَمُونَ فَتِيلًا (۴۹) انْظُرْ كَيْفَ
يَفْتَرُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ وَكَفَىٰ بِهِ إِثْمًا مُبِينًا (۵۰) أَلَمْ تَرَ إِلَى
الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِنَ الْكِتَابِ يُؤْمِنُونَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوتِ وَيَقُولُونَ لِلَّذِينَ
كَفَرُوا هَٰؤُلَاءِ أَهْدَىٰ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا سَبِيلًا (۵۱) أُولَٰئِكَ الَّذِينَ
لَعَنَهُمُ اللَّهُ وَمَنْ يَلْعَنِ اللَّهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهُ نَصِيرًا (۵۲)

جبت اور طاغوت

'جبت' سے مراد اعمال سفلیہ، مثلاً سحر، شعبدہ، ٹونے ٹوٹکے، رمل، جفر، فال گیری، نجوم، آگ پر چلنا اور اس قسم کی دوسری خرافات ہیں۔ ہاتھ کی لکیروں کا علم بھی اسی میں شامل ہے۔

سورہ بقرہ کی تفسیر میں آیات ۲۸۶-۲۰۰ کے تحت ہم تفصیل کے ساتھ بیان کر چکے ہیں کہ یہود اپنے دور زوال میں کتاب الٰہی کو پس پشت ڈال کر بس انہی چیزوں کے ہو کر رہ گئے تھے۔ ان کے انبیا نے نہایت درد انگیز الفاظ میں ان کی اس حالت پر نوحہ کیا ہے۔ اس سے متعلق ضروری حوالے وہاں نقل ہو گئے ہیں۔ یہاں اعادے میں طوالت ہو گی۔

'طاغوت' پر بھی تفصیلی بحث بقرہ کی آیت ۲۵۶ کے تحت گزر چکی ہے۔

دین کی بنیاد توحید ہے

دین کی بنیاد توحید پر ہے۔ یہ صرف عقیدوں میں سے ایک عقیدہ ہی نہیں ہے بلکہ سارے دین کے قیام و بقا کا انحصار اسی پر ہے۔ جو لوگ ہر پہلو سے اس کی حفاظت کرتے ہیں وہ اپنی دوسری کوتاہیوں کے باوجود اپنے اصل دین کی حفاظت کرتے ہیں۔ برعکس اس کے جو لوگ توحید میں رخنہ پیدا کر دیتے ہیں وہ اصل دین کو منہدم کر دیتے ہیں۔ چنانچہ ان کے دوسرے کام بھی، جو بظاہر دینداری کے ہوں، بالکل بے سود ہو کے رہ جاتے ہیں۔ اس

وجہ سے اللہ تعالیٰ شرک کو معاف نہیں فرمائے گا لیکن دوسرے گناہوں کو جن کے لیے چاہے گا معاف فرما دے گا۔ 'جن کے لیے چاہے گا' کی قید اس بات کی دلیل ہے کہ دوسرے گناہوں کے معاملے میں بھی کسی کو دلیر نہیں ہونا چاہیے اس لیے کہ ان کی معافی بھی اللہ ہی کی مشیت پر منحصر ہے۔ اس کی مشیت میں نہ تو کسی دوسرے کو کوئی دخل ہے، نہ اس کی کوئی مشیت حکمت سے خالی ہے۔ علاوہ ازیں گناہوں کے معاملے میں دیدہ دلیری اور ڈھٹائی بجائے خود بھی شرک کی ایک قسم ہے۔

شرک کو اللہ تعالیٰ معاف نہیں فرمائے گا۔

یہ تمہید اس حقیقت کو واضح کرنے کے لیے بیان ہوئی ہے کہ یہود جو لعنت کے مستحق قرار پائے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ حامل کتاب ہوتے ہوئے انہوں نے دین کی جو بنیاد ہے وہ اکھاڑ دی ہے اور اس کی جگہ انہوں نے شرک کو اختیار کر لیا ہے۔ شرک اللہ پر ایک افترائے عظیم ہے جس کو اللہ تعالیٰ کبھی معاف فرمانے والا نہیں ہے۔ شرک کو افترا کہنے کی وجہ ہم دوسری جگہ واضح کر چکے ہیں کہ شرک کرنے والے اپنی تمام مشرکانہ حرکات کو دین کی سند دینے کے لیے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ان باتوں کا حکم ان کو اللہ تعالیٰ نے دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ پر صریح تہمت ہے۔ اور اگر کوئی گروہ، جو اللہ کے دین کی گواہی دینے پر مامور ہو، وہ خدا پر تہمت باندھنے کا پیشہ اختیار کرے تو وہ لعنت کے سوا اور کس چیز کا مستحق ہو سکتا ہے!

اس تمہید کے بعد یہاں ان کے تین قسم کے شرک گنائے ہیں۔

یہود کے مشرکانہ اعمال و عقائد

ایک یہ کہ یہ اپنے آپ کو ایک برتر اور برگزیدہ گروہ سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ یہ اللہ کے محبوبوں کی اولاد اور خود خدا کے محبوب اور چہیتے ہیں اس وجہ سے ان کے لیے خدا کے ہاں کوئی باز پرس یا سزا نہیں ہے۔ ان کے اعمال و اخلاق خواہ کچھ ہوں، اول تو یہ دوزخ میں ڈالے ہی نہیں جائیں گے۔ اگر ڈالے بھی گئے تو محض تھوڑی مدت کے لیے۔ اس گھمنڈ نے ان کو عمل اور اطاعت کی ذمہ داریوں سے بالکل فارغ کر دیا ہے اور انہوں نے اپنے آپ کو بندگی کے دائرے سے نکال کر الوہیت کے زمرے میں داخل کر لیا ہے حالانکہ کہیں بھی اللہ نے ان کو برگزیدگی کی یہ مسند عطا نہیں فرمائی ہے۔ جس کسی کو برگزیدگی عطا ہوتی ہے وہ خدا ہی کی طرف سے عطا ہوتی ہے اور خدا نے اس چیز کو ایمان و عمل اور نیکی و تقویٰ سے وابستہ کیا ہے نہ کہ نسل و نسب سے۔ ہر شخص جو کچھ کرے گا وہ بھرے گا۔ اللہ ان کے ساتھ ذرہ برابر بھی ناانصافی کرنے والا نہیں۔ اپنی برتری کا یہ عقیدہ جو انھوں نے گھڑا ہے، یہ ان کا اپنا

طبع زاد ہے اس کو خدا سے جو وہ منسوب کرتے ہیں تو یہ خدا پر جھوٹا افترا ہے اور ان کے مجرم ہونے کے لیے دوسرے جرائم سے قطع نظر یہی جرم کافی ہے۔

اعمال سفلیہ اور ارواح خبیثہ

دوسرا یہ کہ حامل کتاب ہوتے ہوئے یہ جبت اور طاغوت پر عقیدہ رکھتے اور اعمال سفلیہ کے قائل اور ان پر عامل ہیں۔ اعمال سفلیہ کے متعلق یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ان کا تعلق بیشتر شیطانی قوتوں اور ارواح خبیثہ سے ہوتا ہے۔ انھی کو یہاں طاغوت کہا گیا ہے۔ جو لوگ ان اعمال کے درپے ہوتے ہیں اول تو وہ ارواح خبیثہ کو بالذات مؤثر مانتے ہیں پھر ان سے تعلق پیدا کرنے اور ان کو اپنے مقاصد میں استعمال کرنے کے لیے ان کو نہ صرف خلاف شرع بلکہ صریح مشرکانہ اعمال کا ارتکاب کرنا پڑتا ہے جس سے عقیدہ اور عمل دونوں یک قلم تباہ ہو کے رہ جاتے ہیں۔ تفسیر سورۂ بقرہ میں اس پر جو کچھ لکھا جا چکا ہے اس پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔

اہل ایمان کے بالمقابل مشرکین کی حمایت

تیسرا یہ کہ یہ لوگ اہل ایمان کے مقابل میں کفار و مشرکین کی حمایت کرتے اور ان کو مسلمانوں سے زیادہ حق و ہدایت پر سمجھتے ہیں۔ یہ بات سورۂ بقرہ اور آل عمران میں بھی گزر چکی ہے۔ یہود اسلام کی مخالفت میں اتنے اندھے ہو گئے تھے کہ کھلم کھلا مشرکین مکہ کو مسلمانوں پر ترجیح دیتے تھے اور اپنی اس مخالفت کے لیے آڑ اسلام کی ان تعلیمات اور رخصتوں کو بناتے تھے جو ان کی بدعات یا ان کی شریعت کے تشددات کے خلاف تھیں۔ مثلاً حدث اور جنابت کی حالت میں، اسلام نے پانی میسر نہ آنے کی صورت میں، تیمم کی اجازت دی تو اس کو بھی انھوں نے فتنہ انگیزی کا ذریعہ بنا لیا اور یہ کہنا شروع کر دیا کہ بھلا جو مذہب جنابت کی حالت میں زمین پر ہاتھ مار کر نماز تک پڑھ لینے کی اجازت دیتا ہو وہ بھی کوئی خدائی مذہب ہو سکتا ہے، ان سے زیادہ اچھا مذہب تو ان بت پرستوں کا ہے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ طہارت کے باب میں یہود کے فقہاء نے اتنے تشددات پیدا کیے تھے کہ آدمی حالتِ جنابت میں بالکل ہی اچھوت بن کے رہ جاتا تھا۔ جنابت تو درکنار انجیل سے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہودی فقہا حضرت مسیحؑ کے صحابہ پر اس بات کے لیے بھی معترض ہوتے تھے کہ یہ لوگ بعض اوقات ہاتھ دھوئے بغیر ہی کھانا کھا لیتے ہیں۔ سیدنا مسیحؑ نے ان کی اسی طرح کی خردہ گیریوں پر ان کو سفیدی پھری ہوئی قبروں سے تشبیہ دی تھی کہ جس طرح قبروں کے اوپر سفیدی پھری ہوئی ہوتی ہے لیکن اندر سڑی گلی ہوئی ہڈیاں ہوتی ہیں اسی طرح یہ لوگ اوپر سے تو بڑے اُجلے اور صاف معلوم ہوتے ہیں لیکن ان کے اندر روٹ کا مال بھرا

ہُوا ہے۔ یہود کی یہی ذہنیت مسلمانوں کے خلاف نمایاں ہوئی۔ وہ مشرکین تک کو گوارا کرنے کے لیے تیار تھے، نہیں تیار تھے تو مسلمانوں کو گوارا کرنے کے لیے! ظاہر ہے کہ جس طرح حق کی حمایت حق پرستی ہے اسی طرح شرک کی حمایت شرک پرستی ہے۔

اس کے بعد فرمایا کہ یہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی ہے۔ اور جن پر اللہ لعنت کر دے ان کا کوئی مددگار ان کے کچھ کام نہیں آ سکتا۔ جس پر خدا کی لعنت ہو جائے خدا کے ہاں سے اس کی جڑ کٹ جاتی ہے اور جس درخت کی جڑ کٹ جائے اسے کوئی لاکھ پانی دے اس سے اس کا ہرا ہونا ممکن نہیں۔

اَمْ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّنَ الْمُلْكِ فَاِذًا لَّا يُؤْتُوْنَ النَّاسَ نَقِيْرًا ﴿۵۳﴾ اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا ﴿۵۴﴾

یہود بنی اسمٰعیل کے حاسد تھے

مُلک سے مراد یہاں خدائی اقتدار و اختیار ہے اور الناس سے مراد یہاں مسلمان ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ کیا خدا کے اقتدار و اختیار میں کچھ ان کی بھی حصہ داری ہے کہ اس کے فضل و انعام میں سے یہ جس کو چاہیں حصہ دیں، جس کو چاہیں محروم کر دیں، چنانچہ اپنے اسی اختیار کی بنا پر وہ مسلمانوں کو خدا کے فضل و کرم سے محروم رکھنا چاہتے ہیں؟ اگر ایسا نہیں ہے — اور ظاہر ہے کہ نہیں ہے — تو پھر اس تمام بوالفضولی سے کیا حاصل؟ تقدیر الٰہی سے پنجہ آزمائی کر کے کون جیتا ہے جو یہ جیت سکیں گے!

اس کے بعد اصل راز سے پردہ اٹھا دیا ہے کہ یہ سارا طوفان اس حسد کا نتیجہ ہے جو یہ مسلمانوں سے رکھتے ہیں۔ ان کو یہ غم و غصہ ہے کہ نبوت تو ان کے خاندان کا حصہ تھی، یہاں کے خاندان سے نکل کر بنی اسمٰعیل کے اندر کس طرح چلی گئی؟ انھیں خبر نہیں ہے کہ نبوت اور شریعت اللہ کا فضل ہے، اللہ جس کو چاہے اپنا فضل بخشے۔ اللہ کے بخشے ہوئے فضل پر حسد کرنا اور اس حسد کے بحران میں مخالفت کے لیے اٹھ کھڑے ہونا خود اللہ سے لڑنے کے مرادف ہے۔ اگر یہ اللہ سے لڑنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں تو لڑیں، ہم نے تو آل ابراہیمؑ کو کتاب و حکمت بھی بخش دی اور ان کو ایک عظیم سلطنت بھی بخش دی۔ یعنی جو کچھ انھیں کرنا ہے کریں، ہم نے تو جو کچھ کرنا تھا کر دیا!

زبان کا ایک اسلوب

فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الاية شرطیہ اور انشائیہ جملوں میں جب اس طرح نفعا

آتا ہے تو اس سے پہلے کلام میں کچھ حذف ہوتا ہے جس کی تفصیل بعد کے جملہ سے ہوتی ہے۔ یہاں مدعا یہ ہے کہ اگر بنی اسمٰعیل پر حسد کی وجہ سے یہ لوگ اس نبی کی مخالفت کر رہے ہیں تو جتنا حسد کرنا ہے کر لیں ہم نے تو آلِ ابراہیمؑ کو کتاب و حکمت بھی بخش دی اور ایک عظیم بادشاہی بھی۔

آلِ ابراہیمؑ اگرچہ عام ہے لیکن یہاں مراد بنی اسمٰعیل ہیں۔ قرینہ اس پر دلیل ہے۔ اس لیے کہ یہ بات بنی اسرائیل کو بطور سرزنش کہی جا رہی ہے۔ اس وجہ سے وہ اس میں شامل نہیں ہو سکتے اور جب وہ شامل نہیں ہو سکتے تو اس کے واحد مصداق صرف بنی اسمٰعیل رہ جاتے ہیں۔ پھر یہاں کتاب و حکمت اور خلافت کے عطا کیے جانے کا ذکر ہے اور یہ عطا کیا جانا بنی اسرائیل پر لعنت کے بعد ہے اس وجہ سے ان کے اس میں شامل ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ علاوہ ازیں تورات سے خود ثابت ہے کہ یہود نے اپنے آپ کو حضرت ابراہیمؑ کے بجائے ہمیشہ حضرت اسحٰقؑ ہی سے منسوب کیا۔ تورات میں ہے کہ "ابراہیمؑ کی اولاد اسحٰقؑ کے نام سے پکاری جائے گی"۔ اس کے برعکس اہلِ عرب اپنے آپ کو ہمیشہ حضرت ابراہیمؑ کی طرف منسوب کرتے رہے ہیں، اس لیے کہ حضرت ابراہیمؑ نے وہیں قیام کیا، وہیں بیت اللہ کی تعمیر فرمائی اور وہیں اپنے تمام مناسک ادا کیے۔

آلِ ابراہیم سے مراد بنی اسمٰعیل ہیں

اس اسلوبِ بیان سے ایک تو یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ بنی اسرائیل یہ نہ خیال کریں کہ آلِ ابراہیمؑ ہونے کا شرف انھی کو حاصل ہے، یہ شرف بنی اسمٰعیل کو بھی حاصل ہے۔ دوسری یہ کہ یہ اللہ تعالیٰ کے اس وعدے کی طرف اشارہ ہے جو اس نے حضرت ابراہیمؑ سے فرمایا تھا اور جو صریحاً حضرت اسمٰعیل اور ان کی اولاد ہی سے متعلق تھا۔ تورات میں یہ وعدہ یوں مذکور ہے۔

> "اور خداوند کے فرشتے نے آسمان سے دوبارہ ابراہام کو پکارا اور کہا کہ خداوند فرماتا ہے کہ چونکہ تو نے یہ کام کیا کہ اپنے بیٹے کو بھی جو تیرا اکلوتا ہے دریغ نہ رکھا اس لیے میں نے بھی اپنی ذات کی قسم کھائی کہ میں تجھے برکت پر برکت دوں گا اور تیری نسل کو بڑھاتے بڑھاتے آسمان کے تاروں اور سمندر کے کنارے کی ریت کے مانند کر دوں گا اور تیری اولاد دشمنوں کے پھاٹک کی مالک ہوگی اور تیری نسل کے وسیلے سے زمین کی سب قومیں برکت پائیں گی کہ تو نے میری بات مانی" کتاب پیدائش باب ۲۲۔

تورات کے اس بیان سے صاف واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ وعدۂ برکت حضرت ابراہیمؑ سے اس وقت فرمایا ہے جب انہوں نے اپنے اکلوتے بیٹے ــ حضرت اسمٰعیلؑ ــ

کی قربانی کے امتحان میں کامیابی حاصل کی ہے۔ اس وجہ سے لازماً یہ وعدہ حضرت اسمٰعیلؑ اور انہی کی نسل سے متعلق ہو سکتا ہے۔

اس وعدے میں تین باتوں کا ذکر ہے۔

ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ ان کو ایک عظیم امت بنائے گا۔

دوسری یہ کہ ان کو عظیم فتوحات حاصل ہوں گی اور دشمنوں کے پھاٹکوں پر ان کا قبضہ ہوگا۔

تیسری یہ کہ اس نسل کے وسیلہ سے زمین کی سب قومیں برکت پائیں گی۔

یہ تینوں وعدے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پورے ہوئے۔ آپؐ کی بعثت سے ایک عظیم امت ظہور میں آئی، یہ امت دشمنوں کے پھاٹکوں کی مالک بنی، اور آپؐ کی دعوت سے تمام عالمِ انسانی کو دین و شریعت کی برکت نصیب ہوئی۔

اسی وعدے کا عملی ظہور ہے جس کی طرف آیت زیرِ بحث میں اشارہ ہے۔ اگرچہ جس وقت یہ آیت نازل ہوئی ہے اس وقت تک یہ وعدہ مکمل طور پر ظاہر نہیں ہوا تھا لیکن اس کے پورے ہونے کے لیے فیصلۂ الٰہی صادر ہو چکا تھا اس وجہ سے اس کو تعبیر اس طرح فرمایا ہے کہ گویا یہ عملاً پورا ہو چکا ہے۔ اس اسلوبِ بیان کی قرآن مجید میں متعدد مثالیں ہیں۔ ہم ایک مثال یہاں پیش کرتے ہیں۔

وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ يَا قَوْمِ
اذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ
جَعَلَ فِيكُمْ أَنْبِيَاءَ وَجَعَلَكُمْ
مُلُوكًا وَآتَاكُمْ مَا لَمْ يُؤْتِ
أَحَدًا مِنَ الْعَالَمِينَ ۝ يَا قَوْمِ
ادْخُلُوا الْأَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِي
كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوا
عَلَىٰ أَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوا خَاسِرِينَ
(مائدہ: ۲۰-۲۱)

اور یاد کرو جب کہ موسیٰ نے اپنی قوم سے
کہا اے میری قوم کے لوگو، اپنے اوپر اللہ کے
فضل کو یاد کرو، کہ اس نے تم میں انبیاء
اٹھائے تمہیں بادشاہ بنایا، اور تمہیں وہ
کچھ بخشا جو دنیا والوں میں سے کسی کو نہیں
بخشا۔ اے میری قوم کے لوگو، اس ارضِ
مقدس میں داخل ہو جاؤ جو اللہ نے تمہارے
لیے لکھ دی ہے اور پیچھے نہ پلٹو کہ
نامراد ہو جاؤ۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ تقریر قوم کے سامنے اس وقت فرمائی ہے جب وہ

اس کی ارضِ مقدس پر حملہ کرنے کی دعوت دے رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس وقت تک ان باتوں میں سے کوئی ایک بات بھی ظہور میں نہیں آئی تھی لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ان باتوں کا فیصلہ ہو چکا تھا اور اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو اپنے اس فیصلے سے آگاہ بھی فرما دیا تھا اس وجہ سے حضرت موسیٰ نے ان کا ذکر اس طرح فرمایا ہے گویا یہ وعدے پورے ہو چکے ہیں۔

اس آیت سے ایک لطیف نکتہ یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ سلطنت و خلافت کتاب و حکمت کے ثمرات و نتائج میں سے ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کسی قوم کو کتاب و حکمت کی نعمت عطا فرماتا ہے اور وہ قوم بھی شکرگزاری کے ساتھ اس کو قبول بھی کر لیتی ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کو امامت و خلافت کا منصب بھی سونپ دیا گیا۔ یہ مضمون بیان تو قرآن مجید میں کئی جگہ ہوا ہے لیکن یہاں خاص اہتمام سے بیان ہوا ہے۔ جو لوگ عربی زبان کا ذوق رکھتے ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ یہاں آتَیْنَا کے فعل کے اعادے میں بڑی بلاغت ہے۔ یہود کا سارا حسد تو اسی وجہ سے تھا کہ وہ جانتے تھے کہ اس قرآن کے ساتھ ساتھ اس زمین کی بادشاہی بھی بندھی ہوئی ہے چنانچہ ان کے اس حسد پر کاری ضرب لگانے کے لیے فرمایا کہ ہم نے نہ صرف کتاب و حکمت ان کو دی بلکہ اس کے ساتھ ہی ایک عظیم سلطنت بھی ان کو دی — تمہارے حسد کے علی الرغم!

فَمِنْهُمْ مَّنْ آمَنَ بِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ صَدَّ عَنْهُ ۚ وَكَفٰى بِجَهَنَّمَ سَعِيْرًا (۵۵)
اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا سَوْفَ نُصْلِيْهِمْ نَارًا ۭ كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ
بَدَّلْنٰھُمْ جُلُوْدًا غَيْرَھَا لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَزِيْزًا حَكِيْمًا (۵۶)
وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُھُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ
خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ لَھُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۡ وَّنُدْخِلُھُمْ ظِلًّا ظَلِيْلًا (۵۷)

یہ آیات بنی اسمٰعیل کے متعلق ہیں۔ فرمایا کہ ان میں سے ایک گروہ تو اس کتاب و حکمت کو قبول کر کے ایمان سے مشرف ہو چکا ہے لیکن ایک گروہ ابھی اس سے روگرداں ہے۔ اس گروہ کے متعلق فرمایا کہ اگر یہ اپنے کفر پر اڑا رہا تو اللہ تعالیٰ اس کو دوزخ میں داخل کرے گا جہاں ان کے عذاب میں کوئی کمی نہیں ہو گی۔ جب جب ان کی کھالیں پک جائیں گی تو ان کو دوسری کھالیں پہنا دی جائیں گی تاکہ ان کا عذاب تازہ ہوتا رہے۔ اللہ عزیز یعنی

غالب ہے کوئی اس کا ہاتھ نہیں پکڑ سکتا۔ حکیم ہے، یعنی اس کا کوئی فعل عدل و حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔

دوسرا گروہ جو ایمان لایا ان کے متعلق فرمایا کہ ان کو ہم جنت میں داخل کریں گے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور اس میں ان کے لیے پاکیزہ بیویاں ہوں گی۔ ان تمام اجزا کی تشریح سورۂ بقرہ میں ہو چکی ہے۔

قرآن نے جہاں کہیں بنی اسمٰعیل پر اپنے اس احسانِ عظیم کا ذکر فرمایا ہے وہاں اس امر کی وضاحت ضرور فرما دی ہے کہ اس احسان کا تعلق ایمان و اسلام سے ہے، مجرد خاندان سے نہیں ہے۔ بنی اسمٰعیل میں سے بھی وہی لوگ اس انعامِ الٰہی میں حصہ دار ہیں جو اس قرآن اور اس نبی پر ایمان لاتے ہیں، جو ایمان نہیں لائے وہ سب دوزخ میں جائیں گے، اسرائیلی ہوں یا اسمٰعیلی۔ سورۂ جمعہ میں فرمایا ہے۔

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ	وہی خدا ہے جس نے امیوں (بنی اسمٰعیل)
رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ	میں انہی میں سے ایک رسول اٹھایا جو
وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ	سناتا ہے ان کو اس کی آیتیں اور ان کو
وَالْحِكْمَةَ ۤ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ	پاک کرتا ہے اور ان کو کتاب و حکمت کی
لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ وَّاٰخَرِيْنَ	تعلیم دیتا ہے اور بے شک وہ اس سے
مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ ۭ وَ	پہلے کھلی گمراہی میں تھے — اور ان
هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝	دوسروں میں بھی جو ابھی تک ان سے
(۲-۳ جمعہ)	ملے نہیں ہیں اور اللہ عزیز و حکیم ہے۔

یہاں بھی آخری ٹکڑے میں کفارِ قریش کی طرف اشارہ ہے جو ابھی تک اس نعمت کو قبول کرنے والوں میں شامل نہیں ہوئے تھے اور الفاظ کچھ تنبیہ کا پہلو لیے ہوئے ہیں۔ یہ تنبیہ اسی لیے ہے کہ بنی اسمٰعیل اس حقیقت سے آگاہ رہیں کہ اللہ نے بہت بڑا فضل ان پر فرمایا ہے لیکن یہ فضل انہی لوگوں کے لیے ہے جو اس کی قدر کریں، جو اس کی قدر نہ کریں گے تو ان کو یہ محض اس بنیاد پر حاصل نہیں ہو جائے گا کہ وہ بنی اسمٰعیل میں سے ہیں۔ چونکہ یہود اسی طرح کی غلط فہمی میں مبتلا ہو کر اللہ تعالیٰ کے فضل سے محروم ہوئے تھے اس وجہ سے پہلے ہی مرحلے میں قرآن نے یہ آگاہی بنی اسمٰعیل کو سنا دی۔

افاداتِ فراہیؒ

خالد مسعود

اسالیبِ قرآن

(۳)

۹ - جملہ معترضہ قرآن مجید کا یہ ایک عام طریقہ ہے کہ اثنائے کلام میں کہیں کہیں جملہ معترضہ کے ذریعے وہ کسی بات کی وضاحت کر دیتا ہے۔ اس اسلوب کے کئی پہلو اور کتنے ایک فوائد ہیں۔ اس اسلوب کی مثالیں حسب ذیل ہیں۔

۱۔ سورۂ صافات آیات ۱۵۸۔ ۱۵۹ میں ہے۔

وَجَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ
نَسَبًا ۭ وَلَقَدْ عَلِمَتِ الْجِنَّةُ
اِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ ۝
سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا
يَصِفُوْنَ ۝

اور انہوں نے خدا اور جنوں کے درمیان
رشتہ داری ٹھہرا رکھی ہے حالانکہ جنات
جانتے ہیں کہ وہ حاضر کئے جانے والے
ہیں۔ پاک ہے خدا اس سے جو یہ
بیان کرتے ہیں۔

یہاں ولقد علمت ...... لمحضرون جملہ معترضہ ہے۔

۲۔ سورۂ روم کی آیت ۱۷، ۱۸

فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَ
حِيْنَ تُصْبِحُوْنَ ۝ وَلَهُ الْحَمْدُ
فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَعَشِيًّا
وَّحِيْنَ تُظْهِرُوْنَ ۝

تو تسبیح کرو اللہ کی شام اور صبح —
وہی سزاوار شکر ہے آسمانوں
اور زمین میں۔ اور پچھلے پہر اور ظہر
کے وقت۔

یہاں ولہ الحمد ... الارض کا کلمہ جملہ معترضہ ہے۔

۳۔ سورۂ انعام آیت ۱۰۰ میں وخلقھم کا کلمہ جملہ معترضہ کی شکل ہے۔ فرمایا۔

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَاۗءَ الْجِنَّ
وَخَلَقَهُمْ وَخَرَقُوْا
لَهٗ بَنِيْنَ وَبَنٰتٍۢ بِغَيْرِ
عِلْمٍ۔

اور انہوں نے جنوں کو اللہ کا شریک
ٹھہرایا۔ حالانکہ اسی نے انہیں پیدا
کیا اور بے دلیل اس کے لیے بیٹے
اور بیٹیاں گھڑ لیے۔

ان مثالوں میں معترضہ جملے چھوٹے ہیں مگر کہیں کہیں طویل جملے بھی ملتے ہیں جن کی وجہ سے ان کے ماقبل اور مابعد کا ربط سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ایسی صورتوں میں جملہ معترضہ لبا اوقات ماقبل سے بالکل متصل ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر سورۂ اعراف میں دیکھئے۔

وَاخْتَارَ مُوْسٰى قَوْمَهٗ سَبْعِيْنَ
رَجُلًا لِّمِيْقَاتِنَا ۚ فَلَمَّآ
اَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ قَالَ رَبِّ
لَوْ شِئْتَ اَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ
وَاِيَّايَ ۭ اَتُهْلِكُنَا بِمَا
فَعَلَ السُّفَهَاۗءُ مِنَّا ۚ اِنْ هِىَ
اِلَّا فِتْنَتُكَ ۭ تُضِلُّ بِهَا
مَنْ تَشَاۗءُ وَتَهْدِيْ مَنْ
تَشَاۗءُ ۭ اَنْتَ وَلِيُّنَا فَاغْفِرْ
لَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ
الْغٰفِرِيْنَ ۝ وَاكْتُبْ لَنَا
فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ
فِي الْاٰخِرَةِ اِنَّا هُدْنَآ اِلَيْكَ ۭ
قَالَ عَذَابِيْٓ اُصِيْبُ بِهٖ
مَنْ اَشَاۗءُ ۚ وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ
كُلَّ شَيْءٍ ۭ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ
يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ
وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا

موسیٰ نے اپنی قوم کے ستر آدمی ہمارے
مقررہ وقت کے لیے چن لیے۔ پھر جب
انہیں زلزلے نے آ لیا تو موسیٰ نے کہا
پروردگار اگر تو چاہتا تو ان کو اور مجھے پہلے
سے ہلاک کر دیتا۔ کیا تو ہمیں ہمارے نادانوں
کی کرتوت کی بنا پر ہلاک کر دے گا؟ یہ تو
تیری آزمائش تھی۔ اس سے تو جسے چاہے
گمراہ کرے اور جسے چاہے ہدایت دے۔
تو ہی ہمارا حامی ہے، ہمیں بخش دے
اور ہم پر رحم فرما۔ تو سب سے اچھا بخشنے
والا ہے۔ ہمارے لیے اس دنیا میں اور
آخرت میں بھلائی لکھ دے، ہم تیری ہی
طرف رجوع کرتے ہیں۔ خدا نے کہا۔ میں
اپنے عذاب میں تو جسے چاہتا ہوں مبتلا کرتا
ہوں لیکن میری رحمت ہر چیز پر پھیلی ہوئی
ہے۔ سو اسے میں ان لوگوں کے لیے رکھوں گا
جو پرہیزگاری اختیار کریں گے
زکوٰۃ دیں گے اور جو ہماری آیتوں پر

يُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ
الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ
يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ
فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ يَاْمُرُهُمْ
بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ
الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ
وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ
وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ
الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ فَالَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَ
نَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ
الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ اُولٰٓئِكَ
هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ قُلْ
يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ
اِلَيْكُمْ جَمِيْعَا الَّذِيْ لَهٗ
مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَآ
اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ
فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ
النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ
بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ
لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝ وَمِنْ قَوْمِ
مُوْسٰٓى اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ
بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ
وَقَطَّعْنٰهُمُ اثْنَتَيْ عَشْرَةَ
اَسْبَاطًا اُمَمًا ......
(۱۵۵ - ۱۶۰)

ایمان رکھیں گے۔ یعنی وہ جو رسول،
نبی امّی، کی پیروی کرتے ہیں، جسے وہ
اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا
ہوا پاتے ہیں۔ وہ انھیں معروف کا حکم
دیتا ہے، منکر سے روکتا ہے، پاکیزہ
چیزوں کو ان کے لیے حلال کرتا ہے،
ناپاک چیزوں کو ان پر حرام کرتا ہے، ان
کے بوجھ اور طوق جو ان پر تھے ان
پر سے اتارتا ہے۔ تو جو لوگ اس پر ایمان
لائے اور اس کی تائید کی اور اس کی
مدد کی اور اس نور کی پیروی کی جو اس
کے ساتھ نازل کیا گیا تو ایسے ہی
لوگ کامیاب ہیں۔ کہہ دے، اے لوگو
میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں
جس کی بادشاہی آسمانوں اور زمین کی
بادشاہی ہے، اس کے سوا کوئی معبود
نہیں، وہی زندگی بخشتا اور مارتا ہے
پس تم ایمان لاؤ اللہ پر اور اس
کے رسول ـــ نبی امی ـــ پر، جو اللہ اور
اس کے کلمات پر یقین رکھتا ہے اور
اس کی پیروی کرو تاکہ تم ہدایت پاؤ۔
اور موسیٰ کی قوم میں ایسے لوگ بھی ہیں
جو حق کا رستہ بتاتے اور اسی کے مطابق
انصاف کرتے ہیں۔ اور ہم نے بنی اسرائیل
کے بارہ قبیلوں کی الگ الگ جماعتیں
بنا دیں ......

حضرت موسیٰ کا یہ قصہ اس سے آگے مزید بارہ آیتوں تک جاتا ہے۔ اس کے درمیان قل یا یہا الناس تا یعدلون، جملہ معترضہ ہے۔ بلکہ میری رائے میں الذین یتبعون الرسول تا المفلحون بھی ایک جملہ معترضہ ہے جس سے مقصود ان لوگوں کے لیے رحمت کا عمومی اظہار کرنا ہے جو پہلے سے حضرت مسیح علیہ السلام پر ایمان لائے اور اس میں یہ تنبیہ بھی ہے کہ رحمت انہی کے لیے خاص ہے کیونکہ قرآن میں یہ بات بکثرت بیان ہوئی ہے کہ جو شخص مسیح علیہ السلام پر ایمان نہ لایا اس کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا مشکل ہوگا اور یہ اس کے پہلے کفر کا نتیجہ ہے۔

اسی طرح سورۂ مریم کی حسب ذیل آیات پر غور کرو۔

قَالَ اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ اٰتٰىنِيَ
الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِيْ نَبِيًّا وَّ
جَعَلَنِيْ مُبٰرَكًا اَيْنَ مَا كُنْتُ
وَاَوْصٰنِيْ بِالصَّلٰوةِ وَ
الزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَيًّا وَّبَرًّا
بِوَالِدَتِيْ وَلَمْ يَجْعَلْنِيْ
جَبَّارًا شَقِيًّا وَالسَّلٰمُ
عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدْتُّ وَيَوْمَ
اَمُوْتُ وَيَوْمَ اُبْعَثُ حَيًّا
ذٰلِكَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ
قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِيْ فِيْهِ
يَمْتَرُوْنَ مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ
يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ سُبْحٰنَهٗ
اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا
يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝
وَاِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ
فَاعْبُدُوْهُ هٰذَا ا

اس نے کہا میں اللہ کا بندہ ہوں،
اس نے مجھے کتاب دی اور نبی
بنایا۔ میں جہاں کہیں بھی اس
نے مجھے صاحبِ برکت بنایا اور
جب تک زندہ رہوں مجھے نماز
اور زکوٰۃ کی وصیت کی۔ اس نے
مجھے والدہ کا وفادار بنایا اور سرکش
اور بدبخت نہیں بنایا۔ سلامتی ہے
مجھ پر اس دن جب میں پیدا کیا
گیا، جس دن میں مروں گا اور جس
دن میں زندہ اٹھایا جاؤں گا۔ یہ
ہے عیسیٰ بن مریم کی حقیقت، ٹھیک
ٹھیک بیان کو جس کے بارے میں
یہ شک کرتے ہیں۔ اللہ کو اس کی
حاجت نہ تھی کہ اولاد ٹھہرائے۔ وہ
اس سے پاک ہے، وہ جب ایک
کام کا فیصلہ کر لیتا ہے تو اسے

صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ۝	حکم دیتا ہے ہو جا، تو وہ ہو جاتا ہے۔
(۳۰ - ۳۶)	اور بیشک اللہ ہی میرا رب اور تمہارا رب ہے تو
	اسی کی عبادت کرو۔ یہی سیدھا راستہ ہے۔

ان آیات میں ذٰلِكَ عِيْسٰى تا كُنْ فَيَكُوْنُ کی آیات جملہ معترضہ ہیں۔

۱۰۔ عطف وغیرہ کے موقع پر اسلوب کی تبدیلی اس کو مثالوں سے سمجھنا چاہیئے۔ سورۂ انعام کی آیت ہے

كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ	اس طرح ہم آیات کی تفصیل کرتے
وَلِتَسْتَبِيْنَ سَبِيْلُ	ہیں کہ انھیں واضح کریں اور تاکہ مجرموں
الْمُجْرِمِيْنَ (۵۵)	کی راہ نمایاں ہو جائے۔

یہاں حرفِ عطف کے ساتھ اسلوب کی تبدیلی اس بات پر دلیل ہے کہ معطوف علیہ میں کوئی چیز محذوف ہے۔ گویا اصل بات یوں ہے۔ کذلک نفصل الایت لتستبین ایاتم ولتستبین سبیل المجرمین

سورۂ انعام کی آیت ۷۵

وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ	اسی طرح ہم نے ابراہیم کو آسمانوں اور
مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ	زمین کے کارخانہ کا مشاہدہ کرایا تاکہ
وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ	اسے علم ہو جائے اور وہ یقین کرنے والوں
الْمُوْقِنِيْنَ	میں سے ہو جائے۔

میں والارض کے بعد لیکون علی علمہ محذوف ہے۔

اسی سورہ کی آیت ۹۲

وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ	یہ بابرکت کتاب ہے تصدیق کرنے والی
مُبٰرَكٌ مُّصَدِّقُ الَّذِيْ	پیشینگوئیوں کی، جسے ہم نے اتارا ہے
بَيْنَ يَدَيْهِ وَلِتُنْذِرَ	تاکہ پہلی کتابوں کی تصدیق کرے اور مرکزی
اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا	بستی اور اس کے گرد و نواح والوں کو تنبیہ کرے

میں لتنذر سے پہلے لیصدق الکتب السابقۃ مقدر ہے۔

اسی طرح سورۂ آل عمران کی آیت ۱۶۶

وَمَآ اَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى	جو تکلیف تمہیں اس دن پہنچی جب دو لشکروں

الْجَمْعٰنِ فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَ	میں مڈبھیڑ ہوئی تو وہ اللہ کے حکم سے تھی تاکہ تم
لِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِيْنَ	یاس نہ ہو جاؤ اور تاکہ اللہ ایمان والوں کو ممیز کرے

یں ولیعلم سے پہلے "لکیلا تحزنوا" مقدر مانا جائے گا۔

کبھی کبھی دو مختلف مواقع میں ایک ہی آیت اسلوب بدل کر آتی ہے۔ اسلوب کی یہ تبدیلی بھی تقدیر کے کسی پہلو میں محذوف پر دلیل ہو سکتی ہے۔ مثال کے طور پر آیت

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا
قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ
لِلّٰهِ (نساء ۱۳۵)

مائدہ ۸ میں یوں آئی ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ
بِالْقِسْطِ

یہاں پہلی آیت کا محذوف دوسری آیت میں کھولا ہے اور دوسری میں جو مقدر ہے اسے پہلی آیت میں کھول دیا ہے۔ گویا دونوں آیتوں میں اصل بات یوں ہے کونوا قوامین للہ بالقسط شہداء للہ بالقسط یعنی اے ایمان والو۔ اللہ کے لیے انصاف کے علمبردار اور اس کے لیے انصاف کی گواہی دینے والے بن جاؤ۔

اسلوب کی تبدیلی کی دوسری مثال سورۂ یونس میں ہے۔ فرمایا۔

فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا	تو جب ہماری طرف سے حق ان کے پاس
قَالُوْٓا اِنَّ هٰذَا لَسِحْرٌ مُّبِيْنٌ	آگیا تو وہ کہنے لگے بلاشبہ یہ کھلا جادو
قَالَ مُوْسٰٓى اَتَقُوْلُوْنَ لِلْحَقِّ لَمَّا	ہے۔ موسیٰ نے کہا حق جب تمہارے پاس
جَآءَكُمْ اَسِحْرٌ هٰذَا وَلَا يُفْلِحُ	آگیا تو اسے کہتے ہو یہ جادو ہے؟ اور حقیقت
السّٰحِرُوْنَ (۷۶ - ۷۷)	یہ ہے کہ جادوگر کبھی فلاح نہیں پاتے۔

اس موقع پر ھذا لسحر مبین اور اسحر ھذا ؟ ہم معنی ہیں۔ استفہام انکاری تو اثبات کے لیے مخصوص ہوتا ہے مگر محض استفہام، اثبات اور نفی دونوں کے لیے آیا کرتا ہے۔ یہاں اثبات کے معنی ہیں۔

جس طرح ایک کلمہ کا حقیقی معنی ہوتا ہے اور اس کے علاوہ کئی مجازی معنی بھی ہوتے ہیں اسی طرح اسلوب کے بھی حقیقی اور متعدد مجازی معنی ہو سکتے ہیں۔ لہذا ایک ایسے کلام میں جس کی دلالتیں بکثرت ہوں، اسالیب کے اختلاف سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر سورۂ بقرہ کی آیت۔

مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰىلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ	جو شخص دشمن ہوا اللہ کا، اس کے فرشتوں کا، اس کے رسولوں کا اور جبریلؑ میکائیلؑ کا، وہ جان لے کہ اللہ کافروں کا دشمن ہے۔

پر اگر غور کیا جائے تو حسب ذیل دلالتیں واضح ہوتی ہیں۔

۱۔ فرشتوں سے دشمنی خدا سے دشمنی ہے۔
۲۔ فرشتوں سے عداوت کفر ہے۔
۳۔ جبریلؑ اور میکائیلؑ، ملائکہ اور پیغام رساں ہیں۔
۴۔ جبریلؑ اور میکائیلؑ ملائکہ اور پیغام رسانوں میں بلند مرتبہ ہیں۔
۵۔ رسول فرشتوں کی ایک قسم ہیں۔
۶۔ انسانوں کے رسولوں سے عداوت ملائکہ کے رسولوں سے عداوت کی قسم میں سے ہے۔
۷۔ یہود جبریلؑ و میکائیلؑ کے دشمن تھے۔
۸۔ یہود اللہ کے دشمن تھے۔

یہ تمام نکات نظم کلام سے بھی سمجھ میں آجاتے ہیں۔

۱۱۔ استعمالات نفی

نفی کے استعمال کے مختلف پہلو یہ ہیں۔

۱۔ ملزوم کی نفی کر کے لازم کی نفی مراد لینا، جیسے امرؤالقیس نے کہا ہے لا یہتدی بمنارہ (صحرا کے میناروں سے رستہ نہیں پایا جا سکتا) یہ اسلوب قرآن مجید میں بکثرت استعمال ہوا ہے۔ مثلاً فرمایا۔

قُلْ اَتُنَبِّـُٔوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي	کہہ دے کیا تم اللہ کو اس چیز کی خبر دیتے ہو جس کو وہ نہ آسمانوں میں جانتا

الْاَرْضِ (یونس ۱۸)	ہے اور نہ زمین میں۔

یہاں لا یعلم میں علم کی نفی سے مراد وجود کی نفی ہے یعنی کائنات میں اور کوئی ہے ہی نہیں۔ اگر ہوتا تو خدا کے علم میں ہوتا۔

سورۂ نور کی آیت ہے۔

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ (۳۷)	وہ لوگ جنھیں اللہ کے ذکر، نماز کی اقامت اور زکوٰۃ کی ادائیگی سے نہ تجارت غافل کرتی ہے اور نہ خرید و فروخت

اس میں بھی بعض مفسرین نے یہ تاویل اختیار کی ہے کہ اللہ کے ذکر میں یکسوئی کے ساتھ مشغول ہونے والے بیع و تجارت کے کام میں خود نہیں پڑتے۔

۲۔ ایک فعل کی نفی کر کے اس کے عکس کا اثبات مراد لینا۔ اس اسلوب پر قرآن میں بکثرت لا یُحِبُّ (محبت نہیں کرتا) کو یُبْغِضُ (دشمنی کرتا ہے) کے معنی میں لیا گیا ہے۔

۳۔ فعل کی نفی اس کے نتیجے کے پہلو سے یا دوسرے الفاظ میں ایک فعل کی نفی اس کے کسی خاص مفہوم کے پہلو سے، یہ پہلو نتیجہ کا بھی ہو سکتا ہے۔ اس اسلوب کی مثالیں یہ ہیں۔

وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى (انفال ۱۷)	جب تو نے پھینکا تو حقیقت میں یہ تو نے نہیں پھینکا، بلکہ اللہ نے پھینکا۔
فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ (انفال ۱۷)	تم نے انہیں قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے انہیں قتل کیا۔

۴۔ مبالغہ کی نفی سے نفی میں مبالغہ کا مفہوم لینا۔ مثلاً

اِنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ۔	اللہ بندوں پر ہرگز ظلم کرنے والا نہیں ہے۔

کلام عرب میں بھی اس اسلوب کی مثالیں بکثرت ہیں مثلاً امرء القیس کا قول ہے وَالْمَرْءُ لَيْسَ بِفَعَّالٍ یا مثلاً فلیس علی شیٔ سواہ بخزان

۵۔ کان اور اسم فاعل کے ساتھ حرف نفی لا کر مستقبل کے معنی پیدا کرنا۔ مثلاً مَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ (وہ ہدایت پانے والے نہیں ہیں)

۶۔ امر واقع کی نفی جو کبھی کبھی نفی جواز بھی ہوتی ہے۔ مثلاً

لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ (روم ۳۰) — اللہ کی پیدا کی ہوئی فطرت میں تبدیلی نہیں ہونی چاہیے۔

یا فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ (بقرہ ۱۹۷) — تو حج میں نہ شہوت کی بات کرنا جائز ہے، نہ فسق و فجور کی اور نہ لڑائی جھگڑے کی۔

جو لوگ عربی زبان سے ناواقف ہونے کے باوجود اجتہاد کے مدعی ہیں انہوں نے نفی وقوع اور نفی جواز سے بے خبری کی وجہ سے بہت ہی غلط نتائج قرآن سے اخذ کیے ہیں اور اس طرح لاعلمی میں قرآن کی تحریف کے مرتکب ہو گئے ہیں۔ (باقی)

اعلان

مولانا حمید الدین فراہیؒ کی حسب ذیل تصانیف کے ترجمے ایک محدود تعداد میں موصول ہوئے ہیں۔ قدردان حضرات رجوع فرمائیں۔ یہ تراجم مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کے قلم سے ہیں اور دائرہ حمیدیہ اعظم گڈھ کے زیر اہتمام طبع ہوئے ہیں۔

				ذبیح کون ہے؟	۱/۷۰
مقدمہ تفسیر نظام القرآن	۰/۹۰	تفسیر سورۂ ذاریات	۱/۳۰	تفسیر سورۂ تحریم	۰/۷۰
تفسیر بسم اللہ و سورۂ فاتحہ	۲/۲۵	تفسیر سورۂ مرسلات	۰/۹۰	تفسیر سورۂ عبس	۰/۷۰
تفسیر سورۂ قیامہ	۰/۹۰	تفسیر سورۂ والتین	۰/۷۰	تفسیر سورۂ والعصر	۰/۹۰
تفسیر سورۂ والشمس	۰/۵۰	تفسیر سورۂ کوثر	۱/۰۰	تفسیر سورۂ کافرون	۰/۲۵
تفسیر سورۂ فیل	۱/۰۰	تفسیر سورۂ لہب	۰/۷۰	تفسیر سورۂ اخلاص	۰/۲۵
		اقسام القرآن	۱/۳۰		

ملنے کا پتہ۔ دارالاشاعت الاسلامیہ امرت روڈ کرشن نگر لاہور

یوسف سلیم چشتی

تصوف کی حقیقت

> ذیل کا مضمون پروفیسر صاحب کی زیر تالیف کتاب "تاریخ تصوف" کا مقدمہ ہے۔ جسے ہم پروفیسر صاحب کے شکریے کے ساتھ شائع کر رہے ہیں۔ موضوع کی اہمیت کے پیش نظر ہم اس کتاب کے بعض دوسرے ابواب بھی قارئین 'میثاق' کی خدمت میں پیش کریں گے۔ انشاءاللہ۔
>
> مدیر

تصوف کی ماہیت

اقوام عالم کے صوفیانہ ادب اور صوفیوں کے اقوال کے مطالعے سے یہ بات واضح ہے کہ اپنی ماہیت کے اعتبار سے تصوف اس اشتیاق کا نام ہے جو ایک صوفی کے دل و دماغ میں خدا سے ملنے کے لئے اس شدت کے ساتھ موجزن ہوتا ہے کہ اس کی پوری عقلی اور جذباتی زندگی پر غالب آجاتا ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ صوفی اسی (خدا) کو اپنا مقصودِ حیات بنا لیتا ہے۔ گفتگو کرتا ہے تو اسی کی، خیال کرتا ہے تو اسی کا، یاد کرتا ہے تو اسی کو، کلمہ پڑھتا ہے تو اسی کا، شفق کی سرخی میں، دریا کی روانی میں، پھولوں کی مہک میں، بلبل کی آواز میں، تاروں کی چمک میں، صحرا کی وسعت میں، باغ کی شادابی میں، غرضیکہ تمام مظاہر فطرت اور مناظر قدرت میں اسے خدا ہی کا جلوہ نظر آتا ہے۔

سمایا ہے تو جب سے نظروں میں میری
جدھر دیکھتا ہوں ادھر تو ہی تو ہے !!

یہیں سے ایک سائنسدان، ایک فلسفی، ایک پیرو مذہب، اور ایک صوفی کے تصورِ خدا میں فرق واضح ہو سکتا ہے جس کی تفصیل ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

(۱) سائنسدانوں کی دو قسمیں ہیں (۱) **قائلین خدا** (۲) **منکرین خدا**

جو سائنسدان خدا کی ہستی کے قائل ہیں وہ اسے صانع کائنات قرار دیتے ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ خدا اس کائنات کو بنانے اور اس میں قوانین فطرت نافذ کرنے کے بعد، اس سے بے

تعلق ہو چکا ہے۔ اس لئے انسان اور خدا میں نہ کوئی رابطہ یا تعلق ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔

(ب) فلاسفر کی بھی دو قسمیں ہیں (۱) قائلین خدا (۲) منکرین خدا۔ جو فلاسفر خدا کی ہستی کے قائل ہیں وہ بھی اُسے صرف صانع کائنات یا علت کائنات ہی قرار دیتے ہیں اور چونکہ وہ غیر متشخص ہے اس لئے انسانوں کے ساتھ ایسا شخصی رابطہ قائم نہیں کر سکتا جیسا کہ مختلف انسانوں میں پایا جاتا ہے۔ مثلاً وہ کسی انسان سے ہمکلام نہیں ہو سکتا یا اگر کوئی انسان اسے پکارے تو وہ جواب نہیں دے سکتا۔ غور سے دیکھا جائے تو سائنسداں اور فلاسفر کے تصورِ خدا میں کوئی فرق نہیں ہے۔

(ج) مذہب کا معاملہ سائنس اور فلسفے سے بالکل جداگانہ ہے۔ سائنس اور فلسفے کی بنیاد انسانی عقل پر ہے مذہب کی بنیاد وحی یا الہام پر ہے جس میں انسانی عقل کو دخل نہیں ہوتا بلکہ خود خدا اپنا کلام کسی بندے پر نازل کرتا ہے۔ جسے عرفِ عام میں رشی، نبی، رسول یا پیغمبر کہتے ہیں۔

مذہب کی رو سے خدا خالق کائنات ہے اور انسان اس سے رابطہ پیدا کر سکتا ہے۔ اس رابطے کی بنیاد اجابت پر ہے کہ خدا خود بندوں کو یہ حکم دیتا ہے کہ اگر تم مجھے پکاروگے تو میں جواب دوں گا۔ ہر مذہب نے دو چیزیں پیش کیں پہلی چیز یہ کہ اگر میری اطاعت کروگے تو میں تمہیں اس کی جزا دوں گا یعنی جنت میں داخل کروں گا اور اگر میری نافرمانی کروگے تو سزا دوں گا یعنی دوزخ میں ڈالوں گا۔

دوسری چیز یہ کہ اگر اطاعت کے علاوہ تم مجھ سے محبت کروگے تو میں تم سے محبت کروں گا اور اس محبت کا ثمرہ یہ ملے گا کہ تمہاری شخصیت میں میری صفات منعکس ہو جائیں گی اور اس قرب یا اتصال کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم بچشمِ دل میرا دیدار کر سکوگے۔

اسی لئے اہل مذہب دو گروہوں میں منقسم ہو گئے۔ جن لوگوں پر عقل کا غلبہ تھا انہوں نے صرف اطاعت (شریعت) کو کافی سمجھا یعنی جنت کو مقصود بنایا۔ لیکن جن لوگوں پر عشق کا غلبہ تھا انہوں نے اطاعت کے علاوہ محبت (طریقت) کو بھی ضروری سمجھا یعنی دیدار کو مقصود بنایا۔ اقبال نے اس شعر میں اسی فرق کو واضح کیا ہے۔

گفت دین عامیاں؟ گفتم شنید
گفت دین عارفاں؟ گفتم کہ دید

دوسرے طبقے کو عرف عام میں صوفی کہتے ہیں اور اس تصریح سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ہر صوفی دراصل عاشق ہوتا ہے۔ عشق اور تصوف مترادف الفاظ ہیں۔

تصوف کیا ہے؟ روح انسانی کا اپنی اصل (خدا) سے واصل ہو جانے کا اشتیاق یا شدید جذبہ ہے۔

یہ جذبہ انسان میں کیسے برانگیختہ ہوا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جب اس نے خدا کی طرف سے یہ نوید سنی کہ اگر تم مجھ سے محبت کروگے تو میں بھی تم سے محبت کروں گا تو اسے یقین ہو گیا کہ وہ شے جسے میں روح یا آتما کہتا ہوں، فی الحقیقت خدا سے جدا نہیں ہے بلکہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے اس سے متصل ہے۔ بالفاظ واضح تر خدا اور روح دونوں ہم جنس ہیں اور قاعدہ کلیہ ہے کہ

الجنسُ یمیلُ الی الجنس (کند ہم جنس باہم جنس پر از)

اگر خدا اور میری روح میں باعتبارِ حقیقت مغائرت ہوتی تو خدا مجھے اپنی ذات سے محبت کا حکم نہ دیتا لہذا معلوم ہوا کہ روح اس کے پاس سے آئی ہے۔

اس کے بعد اس نے اپنی ذات میں یا اپنے باطن میں غور کیا تو اسے معلوم ہوا کہ میری خودی بھی

۱۔ شیدائے جمالِ مطلق ہے یعنی کسی ایسی ہستی سے محبت کرنا چاہتی ہے جس سے جمیل تر یا خوب تر یا حسین تر ہستی متصور نہیں ہو سکتی۔

۲۔ ابدیت سے ہمکنار ہونا چاہتی ہے۔

تو اسے یقین ہو گیا کہ میری روح واقعی خدا ہی کے پاس سے آئی ہے کیونکہ اگر خدا مجھ سے محبت کرتا ہے تو میری روح بھی اس سے محبت کرتی ہے یہ ہے وہ مرکزی نقطۂ خیال (جس کی صداقت سالک پر، مراقبے اور مشاہدے کے بعد، روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے) جس پر تصوف کا سارا کاروبار مبنی ہے۔ اقبال نے اس شعر میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

بکنارت آرمیدم، تو بجوشش خود نمائی
بکنارہ برفگندی، در آبدار خود را

اگر یہاں یہ شبہ لاحق ہو کہ یہ صداقت (کہ روح انسانی، ذات حق سے صادر ہوئی ہے اور اس سے ملنے کے لئے بیتاب ہے) ہر شخص پر منکشف نہیں ہوتی تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ طلب ہر انسان کے دل میں موجود ہے۔ مگر اکثر و بیشتر بنی آدم، مادیات میں اس قدر منہمک رہتے ہیں کہ کبھی اپنے باطن اور اس کے تقاضے کی طرف متوجہ ہی نہیں ہوتے۔ اکبر الہ آبادی نے اس شعر میں اسی طرف اشارہ کیا ہے۔

ہم کیا کہیں احباب کیا کارِ نمایاں کر گئے۔
بی اے ہوئے ڈپٹی بنے، پنشن ملی پھر مر گئے

ایک شعر اقبال کا بھی غور طلب ہے۔

یہ مشرق اس سے بری ہے نہ مغرب اس سے بری
جہاں میں عام ہے قلب و نظر کی رنجوری

مطلب یہ ہے کہ جب انسان خدا کے بجائے دنیا (زن، زر، زمین) کو اپنا مقصود و مطلوب و محبوب بنالیتا ہے تو قلب اور نظر دونوں قوتیں رنجور ہو جاتی ہیں اور اگر مداوا نہ کیا جائے تو بموجب قانونِ قدرت دونوں مرجاتی ہیں اور ان کے مرجانے سے انسان مرجاتا ہے صرف حیوان باقی رہ جاتا ہے۔ سچ کہا ہے اقبال نے:۔

ہر کہ حق' لا یموت آمد حق است
زیستن با حق حیات مطلق است

اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے اندر (دل میں) اپنی محبت کی شمع روشن کر دی ہے اور ذکر الٰہی بمنزلہ روغن ہے اگر روغن ختم ہو جائے تو شمع کا بجھ جانا یقینی ہے۔

تصوف کیا ہے؟ مذہب کی روح ہے۔ اس نکتے کو سمجھنے کے لئے اس بات پر غور کرنا ضروری ہے کہ مذہب دراصل یعنی اپنی حقیقت کے لحاظ سے، زندہ خدا کے ساتھ رابطہ پیدا کرنے کا نام ہے۔ ارکان، شعائر، مناسک، رسوم، قواعد، ظواہر یعنی احکام شرع یہ سب اس رابطے کے حصول کے ذرائع ہیں۔ بالفاظِ صحیح تر یہ سب مقصود بالعرض ہیں نہ کہ مقصود بالذات۔ اگر مقصود بالذات (رابطہ یا تعلق مع اللہ) پیش نظر ہے تو سب مفید بھی ہیں اور ضروری بھی۔ لیکن اگر کوئی شخص وسائط ہی کو مقصود بنالے تو وہ شخص کبھی اپنے مقصودِ حقیقی کو حاصل نہیں کر سکتا۔

تصوف ہی وہ رہنما اور مشیر و ناصح ہے جو ہر وقت انسان (سالک) کو تلقین کرتا رہتا ہے کہ دیکھنا کہیں مقصود نگاہ سے اوجھل نہ ہو جائے! اے انسان! تیرا مقصودِ حقیقی اللہ سے رابطہ یا تعلق پیدا کرنا ہے۔ اس لئے جب تو نماز پڑھنے کھڑا ہو اور یہ دیکھے کہ مصلیٰ پاک ہے یا نہیں؟ منہ قبلے کی طرف ہے یا نہیں؟ تو ان ظواہر کے ساتھ ساتھ یہ بھی تو دیکھ کہ تیرا تصور پاک ہے یا نہیں؟ دل اللہ کی طرف ہے یا نہیں؟ وقس علیٰ ہٰذا۔ اگر بحالت نماز تیرا دل دنیا کی طرف ہے تو ایسی نماز بے حضور ہے ظاہرِ شرع کا تقاضا تو پورا ہو جائے گا لیکن اللہ سے تعلق پیدا نہ ہو سکے گا اور جب اس سے تعلق پیدا نہ ہو تو نماز اکارت گئی۔

اقبال نے اس شعر میں اسی حقیقت کو واضح کیا ہے

تیرا امام بے حضور، تیری نماز بے سرور
ایسی نماز سے گذر، ایسے امام سے گذر

قصہ مختصر تصوف ہر قدم پر، ہر بات میں، ہر وقت سالک کو تنبیہ کرتا رہتا ہے کہ دیکھنا! اللہ (مقصود) نگاہ سے اوجھل نہ ہو جائے۔ اکبر الٰہ آبادی نے کیا خوب کہا ہے:۔

قرآن سے ہے پیش نظر، یہ ہے شریعت
اللہ ہے پیش نظر، یہ ہے طریقت

تصوف سالک کو تنبیہ کرتا ہے کہ اگر تو اللہ سے ایک لمحے کے لئے بھی غافل ہو گیا تو ہفتوں بلکہ مہینوں میں بھی اس غفلت کی تلافی نہ ہو سکے گی۔

رفتم کہ خار از پا کشم، محمل نہاں شد از نظر
یک لحظہ غافل بودم و صد سالہ راہم دور شد

جو شخص کسی مذہب کا پیرو ہے مگر تصوف پر عامل نہیں، اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے ساری عمر کسی حلوائی کی دکان میں حلوہ بنایا مگر خود کبھی حلوہ نہ کھایا۔

تصوف ہی کی بدولت انسان، اس اللہ سے زندہ رابطہ پیدا کر سکتا ہے جسے وہ اپنا معبود یا مسجود یقین کرتا ہے۔ فقیہ کہتا ہے۔ اے مسلمان! اللہ کا نام لے۔ صوفی کہتا ہے کہ اے مسلمان! اللہ کا نام ضرور لے کیونکہ حکم شرع یہی ہے، مگر اس طرح لے کہ وہ تیرے دل میں بس جائے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ پھر تیری شخصیت سے اللہ کا اظہار ہوگا اور جو تیرے پاس بیٹھے گا اسے تیرے وجود سے اللہ کی خوشبو آئے گی۔ بالفاظ دیگر، محض زبان سے نام لینا کافی نہیں ہے۔ زبان کے ساتھ دل سے بھی اُسی کا نام لے۔ یہ تو منافقت ہے کہ زبان پر اللہ کا نام ہو اور دل میں شیطان ہو

تو عرب ہو یا عجم ہو، تیرا لا الٰہ الا اللہ
لغت غریب جب تک ترا نہ دے گواہی

قصہ مختصر تصوف کیا ہے؟ دل کی نگہبانی کا دوسرا نام ہے۔ کیونکہ انسان بظاہر جسم اور نفس کا نام ہے مگر درحقیقت، دل کا نام ہے اور اگر دل مسلمان نہ ہو سکا تو رکوع و سجود یا زبان سے خدا کا اقرار، دونوں بے معنی ہیں۔

خرد نے کہہ بھی دیا لا الٰہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

بس تصوف، دل و نگاہ کو مسلمان بنا دیتا ہے اور راقم الحروف اپنے پچاس سالہ تجارب کے بعد یہ بات علیٰ وجہ البصیرت کہہ سکتا ہے کہ تصوف کے علاوہ دل و نگاہ کو مسلمان بنانے کی اور کوئی صورت نہیں ہے۔ خود اقبال کا مشورہ بھی یہی ہے۔

می نروید تخم دل از آب و گل
بے نگاہے از خداوندان دل

یعنی جب تک کوئی شخص "خداوندانِ دل" کی صحبت اختیار نہیں کرے گا اس وقت تک دل حقیقی معنیٰ میں دل نہیں بن سکتا اور بات بھی معقول ہے۔ چراغ تو چراغ ہی سے روشن ہو سکتا ہے۔ دین (اور تصوف، دین کی روح ہے) نہ کتابوں سے پیدا ہو سکتا ہے نہ کالجوں سے وہ صرف نظر سے پیدا ہو سکتا ہے۔

دین مجو اندر کتب اے بے خبر
علم و حکمت از کتب، دیں از نظر (اقبال)

نہ کتابوں سے نہ کالج سے نہ زر سے پیدا
دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا (اکبر)

ان دونوں کے مرشد بھی یہی فرماتے ہیں:۔

گر تو سنگ خارہ و مرمر بوی
چوں بصاحب دل رسی گوہر شوی (رومی)

تصوف کیا ہے؟ انسانی روح کا ذاتی تقاضا ہے اپنی اصل سے واصل ہونے کے لئے جو اس کی گہرائی میں سے ابھرتا ہے۔ اس تقاضے کا انسان کی خارجی (مادی) دنیاوی زندگی سے کوئی علاقہ نہیں ہے۔ یعنی یہ تقاضا خارج سے انسان پر وارد نہیں ہوتا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ مناسب ماحول میسر نہ آسکے تو دب جاتا ہے اور اگر میسر آجائے تو اس میں شدت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس تقاضے کا نتیجہ اس رجحان طبع کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے جس کی بدولت انسان اپنی پوری شخصیت کو دنیا کی عارضی اور فانی دلچسپیوں سے ہٹا کر خدا سے وابستہ کر دیتا ہے اور اپنی پوری توجہ اس کے حصول پر مرکوز کر دیتا ہے۔

یہ رجحان طبع انسان کے دل میں خدا، خودی اور کائنات کا ایک خاص تصور قائم کر دیتا ہے۔ وھوھذا:۔ (ا) اس کی رو سے حقیقی وجود صرف خدا کے لئے ہے یعنی حقیقی معنیٰ میں صرف خدا ہی موجود ہے۔ لا موجود الا اللہ۔ (ب) خودی (روح) اس حقیقی وجود سے صادر ہوئی ہے جیسے آفتاب سے شعاع کا صدور ہوتا ہے۔ اسی لئے خودی اور خدا میں ایک شدید رابطہ یا اتصال ہے۔

اتصال بے تکیف بے قیاس
ہست رب الناس را با جان ناس (رومیؒ)

یہی وجہ ہے کہ خودی یا روح کو مادی دنیا کی کسی چیز سے قرار یا اطمینان حاصل نہیں ہو سکتا۔ ہو بھی کیسے سکتا ہے؟ صحبت ناجنس تو عذاب الیم ہے۔ جس سے آشنائی نہ ہو اس کی صحبت کیسے راس آسکتی ہے؟ اسی لئے اقبال نے یہ مشورہ دیا ہے۔

از ہمہ کس کنارہ گیر صحبت آشنا طلب
ہم ز خدا خودی طلب، ہم ز خودی خدا طلب

(ج) کائنات کیا ہے؟ خدا کی جلوہ گاہ ہے۔ ہر شئے سے وہی ظاہر ہو رہا ہے۔ یعنی کائنات مظہر اسماء و صفات ہے۔

چشم بکشا کہ جلوۂ دلدار
متجلی است از در و دیوار! (عطارؒ)

کہ بچشمان دل مبیں جز دوست
ہر چہ بینی بداں کہ مظہر اوست

یہی وحدۃ الوجود ہے اور ہر صوفی وحدۃ الوجود کا قائل ہوتا ہے۔ خدا وحدہٗ حقیقی ہے یعنی جس طرح کوئی شئے ذات میں اس کی شریک نہیں ہے، وجود میں بھی شریک نہیں ہے۔

جاروب لا بیار کہ ایں شرک فی الوجود
با گرد فرش و سینۂ ایواں برابر است

تصوف کی اہمیت

انسان کی عقلی اور روحانی زندگی میں تصوف کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ عصر حاضر کا مشہور فلسفی برٹرینڈ رسل (RUSSELL) جس کے بارے میں کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ تصوف کا حامی ہے، یہ کہتا ہے کہ "دنیا میں جس قدر عظیم ترین فلسفی گذرے ہیں، سب نے فلسفے کے ساتھ تصوف کی ضرورت کا بھی اعتراف کیا ہے۔ دنیا کے افکار میں انتہائی بلند مقام صرف سائنس اور تصوف کے اتحاد سے حاصل ہو سکتا ہے اور بہترین انسانی خوبیوں کا اظہار بھی صرف تصوف ہی کے ذریعے سے ممکن ہے۔" (تصوف اور منطق اور دیگر مضامین مصنفہ برٹرینڈ رسل صـ ۱۲)۔

رسل نے اپنے دعوے کے ثبوت میں حسب ذیل فلاسفہ کے نام بطور مثال پیش کئے ہیں:۔ ہرقلیطوس، پارمینائڈیز، افلاطون، اسپنوزا۔ ظاہر ہے کہ یہ فہرست جامع نہیں ہے۔ اس لئے میں چند اسماء کا اضافہ کئے دیتا ہوں۔ مثلاً برونو، ہیگل، برگساں، اور وہائٹ ہیڈ۔

تصوف کی خصوصیت

تصوف کی سب سے بڑی خصوصیت جو اسے دنیا کے دوسرے تمام علوم و فنون سے ممیز کرتی ہے، یہ ہے کہ اس کی بدولت خدا، انسان کا محبوب بن جاتا ہے۔

یہاں اگر کسی کو یہ شبہ لاحق ہو کہ مذہب بھی خدا سے محبت کا سبق سکھاتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اسی لیے تو میں نے ابتدائی بحث میں یہ لکھا ہے کہ تصوف، مذہب کی روح ہے۔ جب کوئی مذہبی آدمی خدا سے محبت کرنے لگتا ہے تو وہ تصوف کے دائرے میں داخل ہو جاتا ہے۔ یعنی صوفی بن جاتا ہے

تصوف کا طریقہ

ہر مذہب، ہر قوم، ہر ملک اور ہر دور کے تصوف کا طریق کار ایک ہی رہا ہے یعنی عشق۔ اگر خدا محبوب ہے، اور انسان محب ہے تو لامحالہ محبوب کے حصول کا طریقہ محبت (عشق) ہی قرار پا سکتا ہے۔ دوسرا کوئی طریقہ نہیں ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ عشق کیا ہے؟ اس کی ماہیت، نوعیت اور خاصیت کیا ہے؟ ان تمام باتوں کی تفصیل آئندہ درج کی جائے گی۔ (انشاءاللہ)

تصوف کی عالمگیریت

مذہب کی طرح تصوف بھی ایک عالمگیر صداقت ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ تصوف، جیسا کہ مذکور ہو چکا ہے، مذہب کی روح ہے۔ تصور مذہب سے کوئی قوم خالی نہیں ہے اس لیے تصوف بھی ہر قوم میں کارفرما رہا ہے۔ اللہ کے طالبین ہر زمانے میں، ہر قوم میں موجود رہے ہیں اور قیامت تک رہیں گے۔

اصول تصوف کی یکسانیت

تصوف کے اصول اور مبادی ہر قوم میں یکساں رہے ہیں، ہر صوفی دراصل عاشق ہوتا ہے۔ اس لیے ہر قوم اور ہر ملک کے تصوف کا دارومدار عشق و محبت ہی پر ہے۔ فرق جو کچھ نظر آتا ہے وہ صرف ظاہری اوضاع و رسوم میں ہے۔ مثلاً جب عید کے دن کسی شہر کے مسلمان عیدگاہ کی طرف جاتے ہیں تو ایک آدمی پیدل عیدگاہ جاتا ہے، چوتھا موٹر میں، دوسرا بیل گاڑی میں، تیسرا فٹن میں۔ ان کی وضع ظاہری اور رفتار میں تو فرق نظر آتا ہے۔ مگر منزل مقصود چاروں کی ایک ہے اور جذبۂ محرکہ (داعیہ باطنی) بھی ایک ہی ہے۔

الغرض صوفی خواہ ہندو ہو یا مسلمان، مقصود دونوں کا ایک ہی ہے۔ مگر ان کے عقائد مذہبی، شعائر مذہبی اور رسوم مذہبی میں اختلاف کی وجہ سے دونوں کے مزاج میں فرق ضرور پیدا ہو جاتا ہے۔ مثلاً ہندو کا تصوف اسے ترک دنیا کی طرف مائل کر دیتا ہے۔ لیکن مسلمان کا تصوف اسے خدمت خلق پر آمادہ کر دیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندو کی نگاہ میں یہ سنسار "بندھن" ہے۔ مگر مسلمان کی نظر میں یہ "مزرعۂ آخرت" ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی تصوف میں "سنیاس" (ترک دنیا) کی تعلیم نہ دی جاتی ہے اور نہ دی جا سکتی ہے۔ ۱۲

فی الجملہ تصوف کے بنیادی اصول جو ہر ملک اور ہر قوم کے تصوف میں یکساں طور پر مسلّم ہیں، حسب ذیل ہیں:

۱۔ حقیقت، واحد ہے، صرف ایک ہے، لاشریک ہے، وحدتِ مطلقہ ہے۔ اسی کو صوفی الحق سے تعبیر کرتا ہے

۲۔ یہ حقیقتِ وحدہ زبان اور بیان، تحریر اور تقریر کی گرفت سے باہر ہے، ہم اسے بذریعہ الفاظ بیان نہیں کر سکتے۔ بقول نظامی

محرمیانِ بارگاہ است
جز بدیں پے نبردہ اند کہ ہست

۳۔ روحِ انسانی، اگرچہ باعتبارِ تعین غیرِ حق ہے مگر باعتبارِ وجود عین حق ہے۔ روح کو موجودہ اصطلاح میں خودی اور حق کو خدا کہتے ہیں اور صوفیہ کا عام دستور ہے کہ اختصاراً اپنا بنیادی عقیدہ بایں طور بیان کرتے ہیں کہ خودی عین خدا ہے۔ اس کا مطلب دراصل وہی ہے جو سطور بالا میں مذکور ہے کہ خودی، باعتبارِ وجود عین خدا ہے۔ مگر باعتبارِ تعین غیرِ خدا ہے۔ صوفی جب کسی عینیت کا اثبات کرتا ہے تو غیریت کا تصور محذوف ہوتا ہے۔ یہی وحدۃ الوجود اور حلول میں بنیادی فرق ہے جو صوفی عینیتِ مطلقہ کا قائل ہے وہ وجودی نہیں ہے حلولی ہے اور حلول راقم الحروف کے مذہب و مشرب میں سراسر الحاد و زندقہ ہے۔ بقول علامہ شبستری:

حلول و اتحاد اینجا محال است
کہ در وحدت دوئی عین ضلال است

۴۔ اس وحدتِ مطلقہ سے وصل ممکن ہے، یعنی خودی خدا سے واصل ہو سکتی ہے۔

۵۔ طریقِ وصل عشق ہے۔

۶۔ عشق کا طریقہ عاشقوں کی صحبت میں بیٹھنے سے حاصل ہو سکتا ہے۔

صحبت از علم کتابی خوشتر است
صحبتِ مردانِ حُر، آدم گر است! (مرید ہندی)

نفس نتواں کشت الا ظلِ پیر
دامنِ آں نفس کش را سخت گیر (مرشد رومیؒ)

انسانی زندگی پر تصوف کا اثر

انسانی زندگی پر تصوف کے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں یا تصوف کا ثمرہ کیا ہے؟ اس سوال کے جواب میں ایک کتاب لکھی جا سکتی ہے بخوف طوالت چند اشارات پر اکتفا کرتا ہوں:-

(۱) سب سے بڑا فائدہ یہ حاصل ہوتا ہے کہ صوفی (اگر وہ حقیقتِ تصوف پر عامل ہے) تمام رذائل اخلاق سے پاک ہو جاتا ہے کیونکہ تصوف (عشق) تمام انسانی عیوب کا ازالہ کر دیتا ہے۔

بقول مرشد رومیؒ

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما
اے طبیب جملہ علت ہائے ما
ہر کرا جامہ ز عشقے چاک شد
او ز حرص و آز کلی پاک شد

اس جگہ اس بات کی صراحت ضروری ہے کہ تصوف میں سارا زور عمل پر دیا جاتا ہے۔ بلکہ تصوف کی تعلیم یہ ہے کہ حقیقی علم (عرفان یا گیان) صرف عمل کے بعد ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ پس جو صوفی عمل نہیں کرتا وہ صوفی نہیں ہے بلکہ فلسفی یا متکلم ہے۔

ہندو رشیوں (عارفوں) نے بھی یہی فرمایا ہے کہ تصوف ان پانچ بنیادی عیوب کا ازالہ کر دیتا ہے جو آتما (روح) کو درشن (دیدار) سے محروم رکھتے ہیں۔

کام (نفسانی خواہش یا شہوت) کرودھ (غضب) موہ (حرص) لوبھ (طمع) اہنکار (خود بینی)

اگر یہ شبہ لاحق ہو کہ مذہب بھی تزکیہ نفس کی تعلیم دیتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہم قبل ازیں اس حقیقت کو واضح کر چکے ہیں کہ تصوف مذہب کی روح ہے۔ مذہب سے جداگانہ کوئی شے نہیں ہے۔

بات یہ ہے کہ عالم دین (خواہ وہ کسی مذہب کا ہو) صرف تعلیم پر اکتفا کرتا ہے۔ یعنی وہ صرف زبان سے اپنے شاگردوں کو اس بات کا علم عطا کر دیتا ہے کہ خدا نے تزکیہ نفس کا حکم دیا ہے۔ لیکن وہ نہ انہیں اس کا طریقہ بتاتا ہے نہ عملاً کسی کا تزکیہ نفس کر کے دکھاتا ہے اس کے پاس صرف تصوری (نظریہ) ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھو کہ عالم دین رنگ فروش ہے۔ رنگ بیچتا ہے مگر چڑھا نہیں سکتا۔

صوفی (عارف) بھی تزکیہ نفس ہی کی تلقین کرتا ہے۔ مگر وہ صرف تلقین پر اکتفا نہیں کرتا۔ وہ اپنے شاگردوں سے یہ کہتا ہے کہ میرے پاس آؤ۔ میری صحبت میں بیٹھو۔ میں بالفعل تمہارے نفس کا تزکیہ کروں گا۔ عالم دین نے تمہیں بتایا ہے کہ خدا ہے۔ میں تمہیں دکھا دوں گا کہ واقعی خدا ہے۔ جب ایک طالب اس عارف (مرشد) کی صحبت اختیار کرتا ہے تو اس پر رنگ چڑھنے لگتا ہے۔ یعنی مرشد دراصل رنگریز ہوتا ہے جو سالک کو خدا کے رنگ میں رنگ دیتا ہے۔ خدا کا رنگ کیا ہے؟ اس کی تفصیل آئندہ کی جائے گی

بہرحال سمجھانا یہ تھا کہ تصوف مذہب کی روح ہے۔ یعنی بندہ خدا کے ساتھ زندہ رابطہ پیدا کرنے یا اسے اپنے باطن کی گہرائیوں میں مشاہدہ کرنے کا دوسرا نام ہے۔ اور جب ایک مذہبی

آدمی رابطہ پیدا کرنا شروع کر دیتا ہے تو خود بخود تصوف کے دائرے میں داخل ہو جاتا ہے۔

(۲) تصوف کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ انسان، کافر اور مومن، ہندو اور مسلمان، کالے اور گورے غرضیکہ ہر شخص سے محبت کرنے لگتا ہے۔

بندۂ عشق از خدا گیرد طریق
می شود بر کافر و مومن شفیق
(اقبال)

اگر کوئی صوفی "کافر" کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے یا اس پر شفقت نہیں کرتا اس کے ساتھ ہمدردی نہیں کرتا اس کے دکھ کو اپنا دکھ نہیں سمجھتا تو وہ ہرگز صوفی نہیں ہے بلکہ بندۂ نفس ہے اور دنیا کو دھوکا دے رہا ہے۔

تصوف کا پہلا سبق یہ ہے کہ سب انسان، اللہ کے پیدا کئے ہوئے ہیں، اس لئے بمنزلہ اللہ کا کنبہ ہیں، چنانچہ ارشاد نبوی بھی یہی ہے "الخلق عیال اللہ"

یہ پہلا سبق تھا کتاب ہدیٰ کا
کہ ساری مخلوق کنبہ خدا کا
(حالی)

چونکہ ہر شے میں اسی کا جلوہ ہے۔ ساری کائنات اس کی جلوہ گاہ ہے۔ ہر شے سے وہی ظاہر ہو رہا ہے۔ اس لئے ہر انسان، مظہر ذات و صفات ہے۔ اگر ہندو میں اس کا جلوہ ہے تو مسلمان میں بھی وہی جلوہ گر ہے۔ اس لئے صوفی جملہ افراد انسانی کو مظاہر ذات سمجھ کر سب سے یکساں محبت کرتا ہے۔ اسی لئے وہ مسجد کے علاوہ گرجے اور صومعے اور مندر کو بھی عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہے بلکہ یوں کہتا ہے:

رکھ تصدیق نہ تھیں آوارہ ! کعبہ، قبلہ، دیر، دوارا !
مسجد، مندر ہیکو نور (خواجہ غلام فریدؒ بہاولپوری)

یعنی اے طالب حق! اس بات پر یقین رکھ اور اپنے دل کو انتشار سے محفوظ رکھ کہ کعبے، دیر، ٹھاکر دوارے، مندر اور مسجد، ہر معبد میں وہی ایک نور جلوہ گر ہے۔ یعنی لوگوں نے مکانوں کے نام تو ضرور مختلف رکھ لئے ہیں مگر مدعا یا مسجود یا مقصود یا محبوب سب کا ایک ہی ہے۔

نتیجہ اس زاویہ نگاہ کا یہ نکلتا ہے کہ صوفی کے دل و دماغ سے تعصب، تنگ نظری، نفرت، حقارت، امتیاز رنگ و نسل، اختلاف عقائد و مذہب، فرقہ بندی، گروہ بندی، بے جا پاسداری اور ناحق کوشی یا باطل پسندی کے جذبات بالکل مٹ جاتے ہیں۔ اسی لئے وہ کسی کو آزار نہیں پہنچا سکتا۔

اس سے کسی کو رنج نہیں پہنچ سکتا۔ انسان تو انسان ہے وہ حیوانات پر بھی رحم کرتا ہے۔

مباش در پئے آزار و ہرچہ خواہی کن !
کہ در طریقتِ ما بیش ازیں گناہے نیست ! (حافظؒ)

خلاصۂ کلام اینکہ تصوف انسان کو رذائل اخلاق سے پاک کر دیتا ہے۔ اور ان کی جگہ بہترین اخلاقی صفات سے مزین کر دیتا ہے۔ لیکن اس بات کا اعادہ ضروری ہے کہ تبدیلی مرشد کی صحبت کے بغیر ناممکن ہے کیونکہ ہر فن، صاحب فن کی صحبت میں رہ کر ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ غوّاصی، طباخی، نجاری، خوش نویسی، ستار نوازی، خیاطی وغیرہ ان میں کوئی فن کتابوں یا تقریروں سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح صیقل گری (تزکیۂ نفس) بھی ایک فن ہے اور کسی صاحب فن کی نگاہ ہی کی بدولت حاصل ہو سکتا ہے۔ تصوف کی پوری تاریخ ہمارے اس دعوے کی صداقت پر شاہد ہے اور تمام انسانوں کا روزمرہ مشاہدہ بھی یہی بتاتا ہے کہ چراغ چراغ سے روشن ہو سکتا ہے۔

میں نے اس بات کی صراحت اس لئے کی ہے کہ اس دور مادیت میں تعلیم یافتہ لوگ عموماً اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ مصوری، موسیقی، خطاطی، سنگ تراشی، نقاشی وغیرہ کے لئے تو صحبت ماہر فن (مرشد) ضروری ہے لیکن تزکیۂ نفس کے لئے کسی ماہر فن (مرشد) کی صحبت ضروری نہیں ہے۔ یہ کام ہر شخص خود کر سکتا ہے۔

لاہور میں "میثاق" مندرجہ ذیل مقامات سے بھی مل سکتا ہے۔

۱۔ ماڈل بک سٹال، ٹولنٹن مارکیٹ دی مال ۲۔ پاک بک سٹال ٹولنٹن مارکیٹ دی مال
۳۔ ڈی موریو اینڈ کمپنی وائی ایم سی اے دی مال ۴۔ کلاسیک بک شال ۴۲۔ دی مال
۵۔ کاشانۂ ادب چوک انارکلی کچہری روڈ ۶۔ نیشنل بک سٹال چوک لوہاری
۷۔ ایم اسماعیل اینڈ برادرز بک سٹال چوک لوہاری ۸۔ مکتبہ پاکستان، چوک لوہاری
۹۔ ایم شمس الدین تاجر کتب زیر مسلم مسجد ۱۰۔ معین نیوز ایجنسی بیرون بازار کرشن نگر
۱۱۔ اوبستان، چوک لکشمی، میکلوڈ روڈ ۱۲۔ القلم بک سٹال فلیمنگ روڈ۔
۱۳۔ بنزلفت نیوز ایجنسی پرانی انارکلی لاہور۔
۱۴۔ اور ریلوے کے تمام بک سٹال

انصار احمد
ایم۔ اے فلسفہ

فلسفہ میں تالیفی نقطۂ نظر کے احیاء کی ضرورت

تاریخ فلسفہ کا سرسری مطالعہ بھی ہم پر یہ واضح کرنے کے لئے کافی ہے کہ فلسفہ کا اصل موضوع کائنات و انسان بحیثیت مجموعی رہے ہیں اور اس کا روائتی تصور و مقام بحیثیت کلی نظریات رہا ہے۔ سقراط سے پہلے کے فلاسفہ اپنے فلسفیانہ فکر میں ایک ایسے بنیادی عنصر کی تلاش میں سرگرداں رہے جو تمام کائنات اور اس کے مظاہر کا عقدہ حل کر سکے۔ اسی طرح افلاطون اور ارسطو کے ہاں فلسفہ صرف علم و دانش کی تدوین ہی کا نام نہ تھا بلکہ اس کا اصل ہدف یہ تھا کہ ایک جامع نظام حیات کی تدوین کی جائے جو تمام انسانی ضروریات و خواہشات خواہ وہ انفرادی ہوں یا اجتماعی، کو کماحقہٗ پورا کر سکے۔ الغرض یونانی مفکرین کے ہاں فلسفے کی کلیت زیادہ اہمیت کی حامل تھی۔ فلسفہ کسی خاص فن یا شعبہ کا نام نہ تھا بلکہ یہ اس دنیا کی حقیقت و ماہیت کے بارے میں ایک عمومی نظریہ تھا جس سے انسانی مسائل کے حقیقت کائنات و انسان کے صحیح پس منظر میں حل کرنے میں مدد لی جاتی تھی۔

فلسفہ کی اس حیثیت کی اہمیت بالکل واضح ہو جاتی ہے جب ہم ارسطو کی پیش کردہ انسان کی تعریف کا بغور مطالعہ کرتے ہیں۔ وہ جب انسان کو معقول حیوان سے تعبیر کرتا ہے تو اس سے یہ نتیجہ از خود مستنبط ہو جاتا ہے کہ انسان کے تمام افعال کا معقول ہونا ضروری ہے اور در حقیقت معقولیت ہی وہ اصل خاصہ ہے جو انسان کو حیوانات سے ممیز کرتا ہے۔ گذشتہ صدی میں شائع شدہ کتاب SECRET OF NEGEL کے مصنف سٹرلنگ نے اسی نقطے کو نہایت وضاحت کے ساتھ اس طرح بیان کیا ہے ..... "سوچنا ہمارے لئے از بس ضروری ہے کیونکہ ہم غور و فکر کے لئے ہی بھیجے گئے ہیں۔ زندگی فکر سے عبارت ہے اور فکر کا وظیفہ ایک اصول غائی کی دریافت ہے۔" اس اصول غائی سے مراد ایسا اصول ہے جس سے جملہ مسائل و سوالات کے حل میں رہنمائی ملتی ہو۔ ایک باشعور انسان کے مختلف افعال حیوانات کی حرکات و سکنات سے اس لحاظ سے ممیز ہیں کہ ان کے پس پردہ ایک فکر اور ایک ذہن کام کر رہا ہوتا ہے جبکہ حیوانات کی حرکات جبلی اور غیر شعوری ہوتی ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک جامع اور منظم فلسفہ کی غیر موجودگی سے فکر

کی نفی ہو جاتی ہے جس کا مطلب بجائے خود انسان سے انسانیت کا سلب کرنا ہے۔

اس اعتبار سے غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ دورِ جدید میں فلسفے کے تمام معروف اور مشہور مکاتیبِ فکر یعنی ایجابیت یا منطقی اثباتیت، تحریکِ تجزیہ لسانی اور وجودیت میں یہ بنیادی نقص قدرِ مشترک کے طور پر موجود ہے کہ ان میں اصل زور تجزیے اور تحلیل (ANALYSIS) پر ہے اور تالیف و ترکیب (SYNTHESIS) کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے حتیٰ کہ بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ موجودہ دور تحلیل و تجزیے کا دور ہے۔ نتیجتاً جہاں اس سے کلیۃً انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس طرزِ فکر سے بعض انتہائی اہم گوشوں پر روشنی پڑی ہے۔ وہاں یہ حقیقت بھی ناقابلِ تردید ہے کہ انسانی غور و فکر اور سوچ و بچار کا انداز کائنات پر بحیثیت کل اور حیاتِ انسانی پر بحیثیت مجموعی نہیں رہا اور فکرِ انسانی کے مجموعی خاکے میں ان کے خد و خال پھیکے پڑتے جا رہے ہیں۔

اثباتیت

اثباتیت کی اصطلاح پہلے پہل فرانسیسی مفکر آگستس کانٹے کے نظریات کے لئے استعمال کی گئی۔ نظریہ اثباتیت کا دعویٰ یہ ہے کہ سب سے اعلیٰ اور قابلِ اعتماد علم وہ ہے جو صرف حسی تجربات کو بیان کرے۔ کانٹے اس دعوے کی بنیاد علم کے ایک ارتقائی قانون کو بناتا ہے جس کی رو سے علم تین مراحل سے گزرتا ہے۔ (الف) الہیاتی (یا بالفاظ صحیح توہماتی) جس میں قدرتی مظاہر کی توجیہہ روحانی قوتوں سے کی جاتی ہے (ب) مابعد الطبیعاتی جس میں اشیا تحلیل ہو کر جواہر (ESSENCES) بن جاتی ہیں (ج) اثباتی جس میں قدرتی مظاہر کی توجیہہ سائنسی طور پر کی جاتی ہے۔

تجربیت کی طرح اثباتیت کا بھی یہ دعویٰ ہے کہ صحیح علم صرف سائنسی علوم ہی مہیا کر سکتے ہیں۔ بعض اوقات سائنس کی حمایت میں اثباتیت تجربیت سے بھی آگے نکل جاتی ہے۔ اثباتیت تجربیت سے دو بنیادی اختلافات رکھتی ہے۔ (۱) اس کا سائنسی تجربہ زیادہ تر منطق پر منحصر ہے۔

(۲) یہ واضح طور پر مابعد الطبیعاتی مسائل کا انکار کرتی ہے۔

اثباتیت تالیفی (SYNTHETIC) اور تجزیاتی (ANALYTIC) قضایا (PROPOSITIONS) کے مابین بنیادی امتیاز کرتی ہے۔ اس کے نزدیک تجزیاتی قضایا وہ ہیں جن میں صرف داخلی اصطلاحات کی تشریح و توضیح ہو چنانچہ ان میں تکرار پائی جاتی ہے اور کوئی خارجی و اضافی حقائق زیرِ بحث نہیں آتے۔ ایسے جملوں کی صداقت کی جانچ منطقی و لسانی تجزیے سے کی جا سکتی ہے جبکہ تالیفی یا ترکیبی قضایا وہ ہیں جن میں خارجی و اضافی حقائق زیرِ بحث آئیں اور واقعاتی

مواد پایا جاتا ہو۔ اثباتیت کے نزدیک ان کی صداقت یا عدمِ صداقت کا فیصلہ کرنے کا حق محض سائنس کو حاصل ہے۔ یہ تفریق بجائے خود مابعد الطبیعاتی جملوں کی معنویت ختم کر دیتی ہے۔ علاوہ ازیں ایک دوسرا اصول جو اصولِ تصدیق (VERIFICHTIONAL THEORY) کہلاتا ہے بالکل واضح طور پر مابعد الطبیعاتی مباحث کی نفی کرتا ہے۔ اس اصول کے مطابق حسی مشاہدہ تجربی تعقلات کی معنویت کی بنیاد قرار دیا گیا ہے۔ اگر کوئی جملہ حسی تجربات سے متعلق نہ ہو تو وہ غیر علمی اور لایعنی ٹھہرایا جاتا ہے ___ اس نظریے کے ماننے والوں کے نزدیک فلسفیانہ، مذہبی اور قدری قضایا معانی سے معرّا اور خالی ہیں۔ اور صرف منطقی اور سائنسی قضیے فی الحقیقت علمی و وقوفی ہیں۔ اس نظریے کا عصری ایڈیشن نسبتاً جدید ہے چونکہ یہ اپنے تجزیوں میں جدید منطقی اصطلاحوں کا استعمال کرتا ہے۔ اس لئے اسے عموماً "منطقی اثباتیت" کا نام دیا جاتا ہے۔

۲۔ تجزیاتی فکر یعنی فلسفہ تجزیہ لسانی

تجزیہ لسانی کی تحریک کوئی مبسوط فلسفیانہ فکر نہیں بلکہ ایک محض طرزِ فکر اور ذہنی رجحان ہے جو مسائل کو ایک مخصوص زاویے سے حل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایجابیت کی طرح تجزیاتی فکر کے علمبردار بھی فلسفے کی کسی مدوّن شکل کے منکر ہیں۔ وہ تجریدی فکر (SPECULATION) کے سخت مخالف ہیں۔ فلسفہ ان کے خیال میں ایک عمل ہے۔ اور اس کی تجزیاتی چیر پھاڑ کا میدان زبان ہے۔

فکر ہذا اثباتیت سے کئی لحاظ سے مختلف ہے۔ لسانی مفکرین عموماً نظریہ تصدیق تسلیم نہیں کرتے ان کے خیال میں یا تو یہ بجائے خود ایک مابعد الطبیعاتی اصول ہے یا تعقلات کی معنویت کے تعین میں بہت زیادہ محدود ہے۔

تجزیہ لسانی کے مفکرین کے نزدیک تعقلات کی معنویت کا معیار نظریہ تصدیق نہیں بلکہ استعمال (USE) ہے۔ ثانیاً یہ جملوں کی تجزیاتی و تالیفی تقسیم کا انکار کرتے ہیں کیونکہ اس کا اطلاق واقعاتی اور زندہ زبانوں کی بول چال میں نہیں ہوتا تھا۔ یہ حضرات لسانی قواعد کی کسی سادہ تعبیر کے خلاف ہیں۔ ان کے خیال میں جملے غیر متعین طور پر کئی مقاصد پورا کرتے ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان مفکرین کے ہاں تجزیے اور زبان پر اتنا زور کیوں ہے۔ اس کا جواب ان کے اس خیال میں پنہاں ہے کہ زبان اور لفظوں کی تعبیر متعدد ذہنی مخمصوں کا سبب بنتی ہیں۔ چنانچہ گلبرٹ رائل کے خیال کے مطابق بعض اندازِ بیان باقاعدہ طور پر گمراہ کن ثابت ہوتے ہیں۔ ان حضرات کا کہنا ہے کہ تاریخِ فکر میں اس قسم کے لسانی معموں کی بھرمار ہے چنانچہ اس تحریک کا مقصد لسانی الجھنوں کی توضیح و تشریح، زبان کے

غلط اور بے جا استعمال کی روک تھام اور مبہم نظریات کی نقاب کشائی ہے۔ فلسفہ بس اسی عمل کا دوسرا نام ہے۔

۲۔ وجودیت

وجودیت کسی ایک مبسوط فکر کا نام نہیں۔ بلکہ اس کے تحت بہت سے مفکرین کے خیالات کو شمار کیا جاتا ہے۔ جو آپس میں بڑی حد تک مختلف ہیں۔ ان سب میں قدر مشترک یہ ہے کہ ان حضرات کے سوچ بچار کا موضوع انسان ہے۔ وجودی مفکرین کا دعویٰ ہے کہ وہ وجودی مسائل پر فاعل کی حیثیت سے غور کرتے ہیں ایک تماشائی کی طرح باہر سے موشگافیاں اور خیال آرائیاں ان کے نزدیک فضول ہیں۔ وجودیت اثباتیت اور تجربہ لسانی سے اس لحاظ سے ممتاز ہے کہ یہ فرد کی موضوعیت (SUBJECTIVTY) کو زیادہ اہم خیال کرتی ہے اس کے نزدیک معروضی فلسفیانہ نظام انسان کے لئے بے کار ہیں:

فلسفہ وجودیت آجکل کے اذہان کے لئے بڑی اپیل رکھتا ہے اس کا وہ اصول جو سب سے زیادہ پرکشش ہے آزادی فرد کا اصول ہے۔ یہ نظریہ سرتاسر وجود سے بحث کرتا ہے۔ مافوق الوجود جواہر (ESSENCES) اس کے دائرہ بحث سے یا تو خارج ہیں یا ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ نظریہ ژاں پال سارترے کے بلند پایہ ناولوں کے ذریعے اتنا عام ہو چکا ہے کہ اس کے بارے میں کچھ زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں البتہ یہ امر قابل غور ہے کہ وجودیت صرف سارترے کی لا مذہبی تعبیرات وجود کا نام ہی نہیں بلکہ کرکیگارڈ اور ہائیڈیگر کے خیالات بھی اس میں اہم مقام رکھتے ہیں جن میں ایک حد تک ماورائیت پائی جاتی ہے۔ —— آئیے اب ہم ان نظریات پر ناقدانہ نظر ڈالیں۔

نظریہ اثباتیت اور تجربہ لسانی کا زبان پر زور کلی طور پر بے جا نہیں۔ قدیم فلاسفہ میں سے بالخصوص افلاطون نے تحقیق لسانی کو فلسفی کے اہم فرائض میں شامل کیا ہے۔ لیکن شاید تاریخ فلسفہ میں پہلی مرتبہ منطقی اثباتیت کے مفکرین نے اس مسئلہ کو کلیتہً فلسفہ کے مترادف قرار دیا ہے واقعہ یہ ہے کہ فلسفیانہ مسائل صرف لسانی ہی نہیں بلکہ اس سے بڑھ کر حقیقت کبریٰ، علم اور اس کی حقانیت اور اخلاقی اقدار ایسے مسائل سے بھی بحث کرتے ہیں اسی سے انکار نہیں کہ اس نظریے کے علمبرداروں نے بہت سے لسانی مبہم امور کی وضاحت کر کے اہم خدمت انجام دی ہے۔ لیکن ما بعد الطبیعاتی قضایا کے انکار میں وہ کسی طرح بھی حق بجانب نہیں ہیں۔

وجودیت ہر دو مذکورہ بالا نظریات سے مختلف ہے۔ وہ لسانی یا منطقی بحثوں میں پڑنے کی بجائے فرد کی موضوعی کیفیات کا مطالعہ کرتی ہے کیونکہ وجودیوں کا خیال ہے کہ یہی کیفیات اصل

حقیقت ہیں۔ وجودیت آزادی فرد پر اس قدر زور دیتی ہے کہ معاشرتی نظام اور اخلاقی اقدار خطرے میں پڑ جاتی ہیں۔ معاشرتی اقدار نوع انسانی کے صدہا سالوں کے تجربات سے تشکیل پاتی ہیں اور بحیثیت مجموعی انسانیت کے ارتقاء، ترقی میں ممد ثابت ہوتی ہیں چنانچہ ان سے منہ موڑنا ایک احمقانہ فعل گردانا جائے گا علاوہ ازیں کلی اور ماورائی تعلقات کا انکار ان حضرات کی کج فکری کا نتیجہ ہے۔ ورنہ یہ ایک امر واقعہ ہے کہ ہر طبع سلیم میں تین ماورائی خواہشات پائی جاتی ہیں جو بعض میں سوتی بعض میں جاگتی اور بعض میں چھپکیاں لیتی رہتی ہیں۔

۱۔ غیر فانی ہونے کی تمنا: یہ تمنا ہر شخص کے دل میں موجود ہوتی ہے خواہ وہ عالم ہو یا جاہل ایک ہل چلانے والا کسان بھی ہمیشگی کی تمنا رکھتا ہے۔

۲۔ اپنی محدودیت کو غیر محدودیت میں تبدیل کرنے کی خواہش: طبع سلیم غیر محدود کو اپنی آغوش میں سمو لینا چاہتا ہے۔ یعنی قطرے میں سمندر بن جانے کی تمنا پائی جاتی ہے۔

۳۔ خواہش کمال: ہر بالغ و عاقل نقص سے بھاگتا ہے اور کمال کے حصول کا خواہش مند ہے ایک چور بھی چوری سے متہم ہونا نہیں چاہتا معلوم ہوا کہ اس میں بھی نقص سے مبرا ہونے کی خواہش ہے۔ اگرچہ وہ عملاً اس کا ارتکاب کرتا ہے۔

انہی خیالات کو علامہ اقبالؒ نے اس طرح بیان کیا ہے۔

؎ ہے ذوق تجلی بھی اسی خاک میں پنہاں
غافل تو نرا صاحب ادراک نہیں ہے

جدید فلسفیانہ نظریے ان انسانی جذبات کو رد کر کے بالکل واقعیت پسندانہ رویہ اختیار کئے ہوئے ہیں جو کسی طرح بھی مناسب نہیں۔ کیونکہ انسان صرف گوشت پوست کا چلتا پھرتا حیوان ہی نہیں بلکہ ایک سوچنے سمجھنے والا دماغ اور ایک حساس دل بھی رکھتا ہے۔ انسانی تاریخ ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ جو ظاہر کرتے ہیں کہ اس میں لامحدود کو چھونے کی تڑپ موجود ہے۔ جو وقتی تاثرات سے دب تو سکتی ہے۔ لیکن ختم نہیں ہو سکتی۔

چنانچہ ضرورت اس بات کی ہے کہ مفکرین تحلیل کے ساتھ ساتھ تالیفی نقطہ نظر کو اپنائیں۔ جو واقعیت اور ماورائیت دونوں کے ساتھ انصاف کر سکے۔ اس کے بغیر فلسفہ صرف ایک ذہنی ریاضت کے درجے تک محدود رہے گا۔ لیکن انسانی زندگی کے لئے ایک مفید اور جامع نظریہ نہیں بن سکے گا۔

بقیہ تذکرہ و تبصرہ ص۶ سے آگے

موخرالذکر کام کے لئے فوری طور پر دو اقدامات کئے گئے۔ ایک یہ کہ مولانا امین احسن اصلاحی کی تفسیر 'تدبر قرآن' جس قدر تحریر میں آچکی تھی اس کی طباعت و اشاعت کا بندوبست کیا گیا۔ تاکہ مولانا حمید الدین فراہیؒ اور مولانا اصلاحی کے عمر بھر کے غور و فکر کا ماحصل لوگوں کے سامنے آسکے۔ اور قرآن حکیم پر تدبر اور غور و فکر کی راہیں کھلیں ـــ اور دوسرے یہ کہ 'میثاق' جس کی اشاعت کا سلسلہ تقریباً ایک سال سے بند تھا اسے دوبارہ جاری کیا گیا جس سے نہ صرف یہ کہ مولانا اصلاحی کے لئے تفسیر کی آئندہ تحریر کے لئے تحریک پیدا ہوئی بلکہ مولانا فراہیؒ کے مسودات کے ترجمے اور اشاعت اور حلقہ تدبر قرآن سے منسلک نوجوانوں کے لئے تحریر اور تصنیف و تالیف کی تربیت کی صورت بھی پیدا ہوئی!

ان دونوں کاموں ـــ یعنی 'تدبر قرآن' کی طباعت و اشاعت اور 'میثاق' کے اجراء ـــ کی کوئی دوسری ممکن العمل صورت چونکہ موجود نہیں تھی لہٰذا مجبوراً راقم الحروف نے ان دونوں کو اپنی ذاتی ذمہ داری پر کیا اور ان کی صورت نجی کاروبار کی رکھی۔ ورنہ واقعہ یہ ہے کہ راقم الحروف کی اولین خواہش یہی تھی کہ 'حلقہ تدبر قرآن' یا 'قرآنی اکیڈمی' کے تحت ہی یہ تمام کام ہوتے۔ ویسے بھی یہ سب ہی جانتے ہیں کہ ان کاموں میں مالی منفعت کی کوئی صورت دور دور تک نظر نہیں آتی۔ الٹا ہمیشہ مسلسل خسارے کا سامنا رہتا ہے۔ راقم الحروف نے یہ بوجھ صرف اس لئے اٹھایا ہے کہ کسی طرح ایک مرتبہ جمود ختم ہو اور حرکت پیدا ہو جائے ـــ پھر جونہی کوئی باقاعدہ ادارہ تشکیل پا جائے اس پورے سلسلے کو سارے 'مالہٗ و ماعلیہ' سمیت اس کے جانب منتقل کر دیا جائے۔ ساتھ ہی یہ بھی واضح رہے کہ 'تدبر قرآن' کی جلد اول کی طباعت اور 'میثاق' میں اس کی اور افادات فراہیؒ کی مسلسل اشاعت محض مولانا اصلاحی کے ساتھ ذاتی مراسم کی بنا پر نہیں بلکہ اس گہرے یقین پر مبنی ہے کہ اگر قرآن حکیم کو مستقبل میں واقعتہً ایک زندہ کتاب ـــ اور انسانیت کے لئے واقعی رہنمائی اور لائحہ عمل بننا ہے تو اس کی کوئی صورت اس کے سوا ممکن نہیں ہے کہ اس پر خالص سائنٹیفک طریق پر غور و فکر کی راہیں روشن ہوں اور اس کے لئے تدبر قرآن کا وہ اسلوب جو مولانا فراہیؒ نے عمر بھر کے غور و فکر کے بعد متعین کیا اور جس پر مولانا اصلاحی نے عملاً ایک علمی تحریک کی بنیاد بھی رکھ دی ہے حد اہم اور نہایت مفید ہے ـــ راقم الحروف اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر جانتا ہے کہ مولانا اصلاحی کی بیش بہا تصانیف 'حقیقت شرک'، 'حقیقت توحید'، 'حقیقت تقویٰ'، 'تدبر قرآن'، 'دعوت دین اور اس کا طریق کار' اور

'تزکیہ نفس' کے مطالعے سے قاری کا براہِ راست تعلق قرآن حکیم سے قائم ہو جاتا ہے، اس کا ذہن قرآن سے مناسبت محسوس کرنے لگتا ہے۔ اور قلب میں اس کے ساتھ انس کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

ـــ افسوس کہ چونکہ ان کتابوں کی طباعت و اشاعت کا کوئی انتظام موجود نہیں ہے۔ لہٰذا یہ جواہر خاک میں مل رہے ہیں اور قرآن کے علم و حکمت کا ایک بڑا خزینہ بے کار ہو کر رہ گیا ہے۔ کاش کہ کچھ اصحابِ ذوق اس جانب توجہ دیں اور کسی ایسے باقاعدہ ادارے کا قیام عمل میں لے آئیں جس کے تحت مندرجہ بالا تمام کاموں کو باقاعدہ اور منضبط شکل میں شروع کیا جا سکے ـــ!

مقدم الذکر کام ـــ یعنی اجتماعیت کے قیام ـــ کے لئے اولاً 'تحریک جماعت اسلامی' شائع کی گئی۔ تاکہ ایک تو وہ لوگ جو جماعت اسلامی سے بھی دلچسپی رکھتے ہیں اور اس سے علیحدہ ہونے والوں سے بھی کسی قدر حسن ظن رکھتے ہیں اور لاعلمی کی بنا پر حیران ہیں کہ جماعت میں پالیسی کا اختلاف کس نوعیت کا تھا ان کے سامنے اختلاف کی صحیح صورت آسکے ـــ دوسرے جماعت اسلامی سے منسلک احباب بھی اپنے موقف پر نظر ثانی کر سکیں اور از سر نو غور کر سکیں کہ آج سے تقریباً دس گیارہ سال قبل پالیسی کے بارے میں جو اختلاف جماعت کے سوچنے سمجھنے والے لوگوں کے مابین رونما ہوا تھا اس میں اختلاف کرنے والوں کی رائے درست تھی یا غلط؟ اور تیسرے علیحدہ ہونے والے حضرات بھی غور کریں کہ وہ جماعت میں کس مقصد سے شامل ہوئے تھے، کس بنیاد پر جماعت سے علیحدہ ہوئے اور اب کیا کر رہے ہیں!

یہ کتاب جس بیان پر مشتمل ہے آج سے تقریباً گیارہ سال قبل جب وہ تحریر ہوا تھا۔ اس وقت اس کا مصنف جماعت اسلامی کا سرگرم کارکن تھا ـــ اور آج چاہے یہ بات کیسی ہی عجیب معلوم ہو واقعہ یہ ہے کہ اُس وقت وہ جماعت کے بغیر اپنے وجود کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس وقت اس نے جو بات اس بیان کے اختتام پر کہی تھی وہ یہ ہے۔

> "میری رائے میں جماعت اسلامی کی اصل تحریک ۱۹۴۷ء میں حقیقتاً اور اصولاً ختم ہو گئی تھی۔ اس کے بعد جماعت اسلامی کی قومی جدوجہد کے ساتھ اس ابتدائی تحریک کے کچھ اثرات ایک عرصے تک برسرِ کار رہے ہیں لیکن اب وہ بھی دم توڑ چکے ہیں۔ اب اس تحریک میں سے اگر کچھ باقی ہے وہ ان چند نیک دل اور مخلص لوگوں کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ جنہیں اس اصل تحریک کی دعوت نے کھینچا تھا اور جو ابھی تک جماعت اسلامی کی قومی تحریک کا دامن اسی اصل تحریک اسلامی کے مغالطے میں تھامے چلے آرہے ہیں اور

اب بھی اگرچہ ان کی اکثریت کچھ کھٹک محسوس کر رہی ہے۔ لیکن سوائے چند ایک کے کوئی نہیں جانتا کہ جسے سینے سے لگائے بیٹھے ہیں وہ ایک ایسی بے جان نعش ہے جس کی روح کبھی کی پرواز کر چکی ہے! مجھے اب مستقبل کے بارے میں بھی کوئی امید ہے تو وہ صرف ان کے خلوص سے ہے کہ اگر آج بھی ان پر واضح ہو جائے کہ فلاں جگہ سے ہم غلط موڑ مڑ آئے ہیں اور اب غلط راستے پر چل رہے تو وہ آگے بڑھنے کی دھن میں غلط راستے ہی پر چلتے رہنے کو گوارا کرنے کی بجائے واپس مڑ کر صحیح راستے کو اختیار کرنے میں پس و پیش سے کام نہ لیں گے چاہے اس طرح انہیں ایک طویل مسافت کو دوبارہ قطع کر کے سفر کو تقریباً از سر نو ہی شروع کرنا پڑے۔

اور اس کا امکان اگر کوئی ہے تو صرف اس طرح کہ پچھلی غلطیوں کا بے لاگ جائزہ لیا جائے، ایک ایک غلطی کا واضح اور شعوری اعتراف ہو اور اس کے جو جو اثرات جہاں جہاں مرتب ہوئے ہیں ان کو ڈھونڈ کر اور کرید کر سامنے لایا جائے — اور اسی کی ایک حقیر سی کوشش میں نے اس طویل بیان میں کی ہے اور اگر یہ کوشش اس اصل تحریک تجدید و احیائے دین کے احیاء میں کچھ بھی مفید ہو سکے جو جماعت اسلامی کے زیر سرکردگی ۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۷ء تک ہندوستان میں جاری رہی تھی تو میں سمجھوں گا کہ یہی میری نجات کے لئے کافی ہے!" (تحریک جماعت اسلامی ص ۲۰۲-۲۰۳)

پھر دس سال بعد جب اس بیان کی کتابی صورت میں اشاعت کا مرحلہ آیا تو اس وقت جو بات اس کے دیباچے میں عرض کی گئی وہ یہ ہے۔

"اور واقعہ یہ ہے کہ اس مفصل بیان کے تحریر کرنے سے بھی مقصود یہی تھا اور اب اس کی اشاعت سے بھی مطلوب یہی ہے کہ کسی طرح اس تحریک کی تجدید اور اس کے احیاء کی صورت پیدا ہو جسے لے کر جماعت اسلامی اٹھی تھی لیکن جسے اس نے تاریخ کی ایک کروٹ پر پیٹھ کے بوجھ کی طرح اتار پھینکا۔

میرے نزدیک نہ مختلف مسلمان ملکوں کو جغرافیائی و وطنی وحدت مان کر ان کے بقاء و استحکام کی سعی و جہد کفر ہے اور نہ ہی مسلمان قوم کو ایک وحدتِ ملی مان کر اس کی فلاح و بہبود کی کوشش دائرہ اسلام سے خارج۔ لیکن تمام مقاصد میں سب سے اعلیٰ مقصد اور تمام کوششوں میں سب سے برتر کوشش اعلائے کلمۃ اللہ کا مقصد اور شہادت حق علی الناس کی کوشش ہے یہ بات جس طرح آج سے پہلے صحیح تھی اس طرح آج بھی حق ہے کہ امت مسلمہ کی غرض تاسیس ہی یہ ہے کہ كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ اور وَكَذَٰلِكَ

جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا ۝ اور آج جب کہ یہ امت بحیثیت مجموعی اپنے اس اصل فرض منصبی کو نہ صرف یہ کہ ادا نہیں کر رہی بلکہ عملاً اس کے بالکل برعکس کوششوں میں مصروف ہے اس امت میں سے صحیح راہ پر ہی کا ہیں۔ جو کم از کم وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝ کے مصداق بن جائیں۔۔۔۔۔۔۔۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فداہ ابی و امی کی حیات طیبہ میں چند مواقع ایسے ملتے ہیں جن پر حضورؐ کے قلب مبارک میں انسانی جذبات بے اختیار امنڈتے ہوئے نظر آتے ہیں ان میں کا ایک موقع وہ ہے جب حضورؐ غزوۂ احد سے واپس مدینہ منورہ تشریف لائے اور آپ نے دیکھا کہ پوری بستی عورتوں کے نوحے اور بین کی آواز سے گونج رہی ہے اس وقت حضورؐ کو بے اختیار اپنے عزیز اور محبوب چچا اور بچپن کے رفیق اور ساتھی بلکہ رضاعی بھائی حضرت حمزہؓ یاد آ گئے اور وفور جذبات میں یہ الفاظ آپ کی زبان مبارک سے نکل گئے۔ "أَمَّا حَمْزَةُ فَلَا بَوَاكِيَ لَهُ" "آہ! حمزہؓ کا رونے والا کوئی نہیں ہے!" بالکل یہی حال آج اس دین کا ہے جو بڑی شان سے جزیرہ نمائے عرب سے نکلا تھا لیکن آج ایسا غریب الغرباء بن گیا ہے کہ اس کے لئے رونے والا کوئی نہ رہا۔ فرمان نبویؐ بَدَأَ الْإِسْلَامُ غَرِيبًا وَسَيَعُودُ كَمَا بَدَأَ" تو مجسم اور متشکل نگاہوں کے سامنے موجود ہے لیکن آنکھیں ان غرباء کو ترس رہی ہیں جو اس غربت اور اجنبیت کے دور میں اس غریب کے ہمدرد و مونس و غم خوار ہوں! اور فَطُوبَىٰ لِلْغُرَبَاءِ کی نوید کے حقدار بن سکیں۔۔۔۔۔۔۔

اگر میری اس تحریر کی اشاعت سے اس "غریب الغرباء" کے پرانے رفقائے سفر میں سے کچھ اس کی رفاقت پر از سر نو کمر ہمت کس لیں تو بس یہی اس کی اشاعت سے مطلوب ہے۔" (ایضاً ص ۱۵-۱۶)

پھر جب کتاب شائع ہو گئی اور اخبارات و جرائد میں اس پر تبصرے ہوئے اور جماعت اسلامی کے کچھ ہم خیال حلقوں کے جانب سے علیحدہ ہونے والوں پر یہ الزامی حجت قائم کی گئی کہ آپ لوگ اگر واقعی اپنے اختلاف میں مخلص تھے تو کیوں نہ علیحدہ ہونے کے بعد آپ نے اپنی دانست میں صحیح خطوط پر کوئی مثبت کام شروع کیا؟ — تو صاف الفاظ میں اعتراف تقصیر کیا گیا۔ ملاحظہ ہو تذکرہ و تبصرہ "میثاق" اگست ۱۹۶۶ء۔

"ہمیں اس کوتاہی اور تقصیر کا صاف اعتراف ہے اور ہم تسلیم کرتے ہیں کہ علیحدہ ہونے والوں پر جماعت اسلامی اور اس کے ہم خیال حضرات کا یہ الزام بالکل درست ہے کہ انہیں مجتمع ہو کر اس

نہج پر عملی جدوجہد کا آغاز کر دینا چاہئے تھا جس کو وہ صحیح سمجھتے تھے۔ . . . . آخر میں ہم جماعت سے علیحدہ ہونے والے حضرات کی خدمت میں یہ گذارش کرنا چاہتے ہیں کہ وہ مذکورہ بالا الزام پر مشتعل ہونے کی بجائے اس پر ٹھنڈے دل سے غور کریں۔ . . . . یہ دوسرے رفقاء کے احساسات کی ترجمانی ہو یا نہ ہو ہماری دیانت دارانہ رائے یہی ہے کہ اسباب خواہ کچھ بھی ہوں بہر حال اس معاملے میں ہم سے مجموعی طور پر کوتاہی ہوئی ہے اور اس الزام کا اصل جواب ہماری جانب سے یہی ہونا چاہئے کہ جماعت اسلامی کے طریق کار میں جن غلطیوں کی نشاندہی کر کے ہم جماعت سے علیحدہ ہوئے تھے ان سے پہلو بچا کر اس مقصد کے لئے اجتماعی جدوجہد شروع کی جائے جس کے لئے جماعت اسلامی قائم ہوئی تھی۔ . . . . ."

ثانیاً ـــ میثاق کے صفحات میں "نقشِ غزل" کے عنوان سے ایک سلسلہ مضامین شروع کیا گیا جس میں وہ تمام واقعات سلسلہ وار پیش کئے گئے جو جماعت میں اختلاف کے رونما ہونے کے بعد پیش آئے اور جن کے نتیجے میں اہل اختلاف کو جماعت سے علیحدگی اختیار کرنی پڑی۔ اس سے دراصل اس غلط فہمی کا ازالہ مقصود تھا کہ یہ علیحدگی اہل اختلاف کی جلد بازی یا مشتعل مزاجی کی بنا پر ہوئی۔ اس کے برعکس یہ حقیقت کھول کر عرض کر دی گئی کہ جماعت میں انتشار کا اصل سبب امیر جماعت کا شدید آمرانہ و مستبدانہ رویہ اور اپنے دیرینہ رفقاء کے ساتھ عامیانہ قسم کی ڈپلومیسی پر مبنی طرز عمل تھا!

ـــ یہ سلسلہ ابھی درمیان ہی میں تھا کہ جماعت کے ایک بزرگ رکن کی جانب سے ایک مراسلے میں وضاحت کے ساتھ وہ اعتراضات موصول ہوئے جو ان دنوں جماعت کے حلقے کی طرف سے عام طور پر کئے جا رہے تھے۔ یعنی ایک یہ کہ آپ لوگ کوئی مثبت کام کیوں شروع نہیں کرتے اور جماعت پر تنقید کو کیوں ضروری سمجھتے ہیں؟ ـــ اور دوسرے یہ کہ کیا آپ جماعت اسلامی کو فتنہ سمجھتے ہیں کہ اس کی سرکوبی آپ کے نزدیک ضروری ہو گئی ہے؟ ـــ اس کے جواب میں "میثاق" کی جنوری ۱۹۶۶ء کی اشاعت میں مختصر الفاظ میں اختلاف کا پورا پس منظر بیان کرنے کے بعد عرض کیا گیا:

"مندرجہ بالا پس منظر میں اوّلاً ہم چودھری صاحب اور ان کے ہم خیال حضرات کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ خود غور فرمائیں کہ ایک ایسا شخص جس نے شعور کی آنکھ جماعت اسلامی کے دامن میں کھولی اور زمانہ طالب علمی میں اپنے بیشتر اوقات اور بہترین صلاحیتوں کو اس تحریک کی سرگرمیوں میں صرف کیا۔ پھر جب اس نے جماعت کے رُخ کی غلطی کو محسوس کیا تو ایک مفصل اور مدلل تحریر کے ذریعے اس کو واضح کیا اور سخت حوصلہ شکن حالات اور اشتعال انگیز ماحول کے باوجود جماعت کے

عام ارکان کے سامنے بھی اپنے نقطہ نظر کو پیش کرنے کی کوشش کی ـــ اور جو آج بھی موجودہ جماعت اسلامی کو ہر اعتبار سے سراسر غلط اور دین و دنیا دونوں کے لئے مضر سمجھنے کے باوجود اس رائے پر قائم ہے کہ اس کی ابتدا اپنی تمام خامیوں اور کوتاہیوں کے باوصف مجموعی طور پر ایک صحیح اسلامی تحریک کے خدوخال رکھتی تھی ـــ جس کی سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ پھر اسی اصل تحریک کا احیاء ہو جسے لے کر جماعت اسلامی اٹھی تھی ـــ اور جو اس امر کی کوشش کرنا چاہتا ہے کہ جو لوگ مختلف اوقات میں اس جماعت سے مایوس ہو کر علیحدہ ہوئے وہ بھی اور جو اب اس کی غلط روی پر متنبہ ہو جائیں وہ بھی مل کر کوشش کریں کہ انہی خطوط پر از سر نو جدوجہد شروع کی جائے جن پر جماعت اسلامی کی تاسیس ہوئی تھی ـــ کیا اس کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ اپنے ماضی اور جماعت کے حال سے بالکل صرف نظر کرے؟

قطع نظر اس سے کہ جب خود جماعت اسلامی کی ابتدا ہوئی تو اس کے ناوک تنقید نے تو اپنے ہم عصروں پر بھی بس نہ کی تھی اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سے لے کر جماعت مجاہدین تک کسی تجدیدی کوشش کو نہ چھوڑا تھا ـــ سیدھی سی بات ہے کہ کسی بھی کام کی ابتدا خلا میں نہیں ہو سکتی۔ اس ملک میں جماعت اسلامی نے دین کا ایک خاص تصور اور احیاء دین کا ایک خاص لائحہ عمل پیش کیا۔ پھر ہزاروں انسانوں کی زندگیوں کو عملاً اس نے اپنی لپیٹ میں لیا اور لاکھوں ذہنوں پر اپنے اثرات قائم کئے۔ پھر جب اس کی قلب ماہیت ہوئی تو جہاں سینکڑوں مخلص اور فعال لوگوں پر سخت مایوسی طاری ہوئی وہاں اس کے نئے فلسفوں اور جدید سرگرمیوں نے اس مسلک سے ہزاروں مخلص لوگوں کے ذہنوں کو مسموم اور عام طور پر ملک کے سوچنے سمجھنے والوں کو دین اور اس کے علمبرداروں کی طرف سے سخت بدظن کر کے رکھ دیا تو کیسے ممکن ہے کہ یہاں دین کا کوئی کام اور وہ بھی ایسا جو جزوی نہ ہو بلکہ انہی ہمہ گیر خطوط پر ہو جن پر جماعت نے ابتداءً کام شروع کیا تھا بغیر اس کے شروع کیا جا سکے کہ جماعت کے ماضی اور حال پر مفصل تبصرہ ہو، غلطیوں کی متعین طور پر نشاندہی کی جائے، تصورِ دین میں کوئی خامی تھی تو اس کو واضح کیا جائے اور لائحہ عمل میں غلطی تھی تو اسے متعین کیا جائے اور گرتے ہوئے حوصلوں کو پھر سے سہارا دے کر تعمیر نو پر آمادہ کیا جائے۔ حیرت ہوتی ہے کہ جماعت سے علیحدہ ہونے والے لوگ اگر اس ہمہ گیر کام کو چھوڑ کر خاموشی سے کسی جزوی خدمت میں لگتے ہیں تو طعنے دیئے جاتے ہیں کہ بس یہی حوصلے تھے ـــ ان حقیر سے جزوی میں کھپ کر رہ گئے! ـــ کیوں نہیں دین کا وہی ہمہ گیر کام کرتے جسے حق جان کر جماعت میں شمولیت اختیار کی تھی ـــ! اور اب اگر ایک کوشش اقامتِ دین کی اس

جامع اور ہمہ گیر تحریک کے احیاء کی کی جا رہی ہے جسے لے کر جماعت اسلامی اٹھی تھی تو وہ لوگ جو حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سے لے کر جماعت مجاہدینؒ تک کے تمام مصلحین امت اور مجاہدین دین کے کارناموں پر تنقید کو ایک علمی کارنامہ سمجھ کر "تلاوت" کرتے ہیں وہ جماعت اسلامی اور اس کے امیر کو ان کے اپنے ماضی کی روشنی میں اور ان کے اپنے بیان کردہ اصولوں کی کسوٹی پر پرکھنے کی ہلکی کوشش پر بھی چلا اٹھتے ہیں! ع

ببیں تفاوتِ رہ از کجا ست تا بہ کجا!" ۔۔۔ اور کہ ۔۔۔

"آپ کا یہ سوال بڑا اہم ہے کہ کیا ہماری رائے میں جماعت اسلامی "فتنہ" ہے اور اگر ہے تو کیا دوسرے فتنوں کی سرکوبی ہو چکی ہے کہ ہم اب اسی کے پیچھے پڑ گئے ہیں؟ اس سلسلے میں ہماری اولین گزارش تو یہ ہے کہ ہمارے نزدیک جماعت اسلامی بالقوہ (POTENTIALLY) یقیناً ایک فتنے کی شکل اختیار کر چکی ہے اگرچہ بالفعل (PRACTICALLY) کوئی بڑا اور موثر فتنہ برپا کرنے کی صلاحیت اس میں موجود نہیں ہے! اس دین میں حکمت عملی کا جو "نیا" مقام اس نے تجویز کیا ہے وہ اپنی فتنہ انگیزی میں دوسرے ہم عصر فتنوں سے کسی طرح کم نہیں ۔ بلکہ اس اعتبار سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے کہ ماضی میں اس کے علمبردار دین کے معاملے میں ایک قابل اعتماد حیثیت کے مالک رہے ہیں۔ عوام کے لئے اس فتنے کی ہلاکت آفرینی اگرچہ اس بنا پر بہت کچھ کم ہو چکی ہے کہ اس پر ایک انتہائی زوردار تنقید بروقت ہو گئی اور اس کے پیش کرنے والے کو اپنے اولاً پیش کردہ نظریے سے بہت کچھ رجوع اور بالآخر بات کو گول مول کرتے ہی بنی ۔۔۔ تاہم جماعت کے دست و بازو یعنی اس کے ارکان اور کارکنوں نے چونکہ ان کے بعد کی تاویلات کو بھی حکمت عملی ہی کی کارفرمائی سمجھ کر اصل نظریے کو حرزِ جاں بنا لیا ہے لہٰذا جماعت کے محدود حلقے میں یہ فتنہ ابھی پوری قوت کے ساتھ موجود ہے۔"

پھر جب یہ بحث شروع ہو گئی تو اس کے کچھ مزید گوشے بھی زیر گفتگو آ گئے اور "نقضِ غزل" کا سلسلہ تو درمیان ہی میں رہ گیا اور بعض دوسرے مسائل پر بحث چھڑ گئی۔ چنانچہ 'میثاق' کے مارچ، اپریل اور مئی ۷۶ء کے اداریوں میں یہ بات واضح کی گئی کہ اپنی گذشتہ تاریخ اور بعد از تقسیم کی پالیسی کے مخصوص فکری اور نفسیاتی پس منظر کے اعتبار سے جماعت اسلامی کا پاکستانی سیاست کے میدان میں اسلام کا نعرہ لگانا اور اس کی سرپرستی فرمانا اسلام کے حق میں نہ صرف یہ کہ قطعاً مفید نہیں ہے، بلکہ نہایت مضر ہے ۔۔۔ اور جون ۷۶ء کے شمارے میں وضاحت کے ساتھ عرض کیا گیا کہ ہند و پاکستان کی جماعت اسلامی بیسویں صدی عیسوی کی احیائے اسلام کی تحریکوں کے جس سلسلے کی ایک کڑی ہے ان سب کے تصورِ دین اور مطالعہ اسلام میں یہ غلطی بنیادی طور پر موجود ہے کہ ان میں سارا زور دین کے اس نظام ظاہر پر ہے جو حیات دنیوی سے بحث کرتا ہے ۔ رہے اس کے بنیادی اعتقادات تو ان کی حیثیت ان کے ہاں بالکل ثانوی ہے حالانکہ مغربی الحاد کے سیلاب کے مقابلے کے لئے اصل ضرورت اس کی ہے کہ امت میں 'تجدیدی ایمان' کی ایک عظیم تحریک برپا ہو۔

یہ ساری داستان اس لئے گوش گزار کی گئی ہے کہ یہ بات واضح ہو جائے کہ تحریک جماعت اسلامی کی اشاعت اور 'میثاق' میں جماعت اسلامی کا ذکر خیر محض دل لگی یا رفع الوقتی کی غرض سے نہیں بلکہ اس مثبت خواہش پر مبنی ہے کہ دین کی جس خدمت کے لئے جماعت اسلامی اولاً قائم ہوئی تھی اور جسے وہ بعض حالات و مواقع کے دامِ ہمرنگِ زمین میں گرفتار ہو کر ترک کر چکی ہے اس کے لئے نئے سرے سے اجتماعی جدوجہد کی کوئی صورت پیدا کی جائے۔

ادھر راقم الحروف اپنی اس حقیر کوشش میں مصروف تھا ادھر خدا کے فضل و کرم سے یہ صورت پیدا ہو گئی کہ جماعت سے علیحدہ ہونے والے لوگوں میں سے ایک اہم اور اہل علم و صاحب تقویٰ بزرگ مولانا عبدالغفار حسن جو اب جامعہ مدینہ میں استاذِ حدیث ہیں گذشتہ سال سالانہ تعطیلات میں پاکستان تشریف لائے تو انہوں نے اسی خیال کے تحت کہ جماعت اسلامی سے علیحدہ ہونے والے لوگوں کے حالات کا براہ راست مشاہدہ کر کے یہ اندازہ کیا جائے کہ کیا ان کے ایک نئی اجتماعیت میں منسلک ہو کر دین کی خدمت کے لئے منظم اجتماعی جدوجہد کرنے کے امکانات موجود ہیں، مغربی پاکستان کے متعدد اہم مقامات کا دورہ کیا۔ ان کے اس دورے کا یہ انتہائی خوشگوار نتیجہ نکلا کہ خواہشِ قیامِ اجتماعیت کی جو چنگاری خاکستر میں دب چکی تھی از سر نو بھڑک اٹھی اور مختلف مقامات کے احباب نے اجتماعیت کے قیام کی تجویز کا پرجوش خیر مقدم کیا ۔۔۔ مولانا موصوف تو ایک ابتدائی تحریک پیدا کر کے تعطیلات کے اختتام پر واپس مدینہ منورہ تشریف لے گئے لیکن مختلف مقامات کے احباب کے مابین اس تجویز پر خط و کتابت میں تبادلہ خیال ہوتا رہا ۔۔۔ جس کے نتیجے میں مغربی پاکستان کے ایک درمیانی مقام پر چند احباب جمع ہوئے اور دو دن میں بعض کے تبادلہ خیال کے بعد وہ ایک قرارداد پر متفق ہو گئے جس میں ایک اجتماعیت کے قیام کا فیصلہ کیا گیا اور اس کے لئے ابتدائی اقدامات کی ذمہ داری شیخ سلطان احمد صاحب پر ڈالی گئی۔ (یہ قرارداد اسی شمارے کے ٹائیٹل کے اندرونی صفحات پر شائع کی جا رہی ہے!)

اس امر پر اللہ تعالیٰ کا جس قدر شکر ادا کیا جائے کم ہے کہ اس نے شیخ سلطان احمد صاحب کی شدید خانگی و کاروباری مصروفیت کے باوجود ان کے لئے اسے ممکن بنا دیا کہ انہوں نے ایک رفیق کی معیت میں از سر نو مغربی پاکستان کے تمام اہم مقامات کا دورہ کیا اور احباب کے ساتھ مزید مفصل

تناظر خیال کیا ــــ اس دورے کے نتائج بھی بہت حوصلہ افزا برآمد ہوئے ــ اور جماعت سے علیحدہ ہونے والے لوگوں کے ایک نئی اجتماعیت میں منسلک ہو کر دین کی خدمت کرنے کے امکانات روشن سے روشن تر ہوگئے۔

حال ہی میں مولانا عبدالغفار حسن اس سال کی تعطیلات میں پھر پاکستان تشریف لائے ہیں اور شیخ سلطان احمد صاحب سے پوری روداد سننے اور باہمی مشورے کے بعد یہ دونوں بزرگ اس امر پر متفق ہیں کہ اس تجویز و تحریک کو مزید آگے بڑھایا جائے اور جلد ہی قیام اجتماعیت کے لئے کوئی ٹھوس اقدام کیا جائے۔

اللہ تعالےٰ ان بزرگوں کی مساعی جمیلہ کو بار آور فرمائے اور ان کے ہاتھوں اپنے دین کی کسی ٹھوس خدمت کی ابتدا کراوے ــ آمین ــ راقم الحروف ان بزرگوں کے ادنیٰ رفیق اور خادم کی حیثیت میں کام کرنے کو اپنی سعادت سمجھے گا اس لئے کہ حق کی شہادت، کلمۃ اللہ کا اعلاء اور دین کا اظہار اس کی اپنی زندگی کا مقصد ہے ــ اور ان بزرگوں کی سرپرستی میں اپنی ان دینی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا نسبتاً آسان تر ہے ــ !

خدانخواستہ اگر ایسا نہ ہوا ــ اور قیام اجتماعیت کی یہ تحریک بھی آٹھ دس سال قبل کی بعض کوششوں کی طرح ناکام ہوگئی ــ تو بھی ظاہر ہے کہ افراد کی ذمہ داری ختم نہیں ہو جاتی۔ ہر فرد اپنی جگہ مسئول رہے گا ــ اور ہر ایک کو اپنی جگہ سعی و جہد جاری رکھنی ہوگی ــ راقم الحروف بغیر کسی ادنیٰ شائبہ تعلّی کے عرض کرتا ہے کہ وہ بہرحال ذاتی حیثیت میں بھی متذکرۃ الصدر دونوں کاموں ــ یعنی ایک عمومی دعوت و تبلیغ اور اصلاح و تربیت کے ادارے اور دوسرے قرآن اکیڈمی کے قیام کے لئے مقدور بھر کوشش کرتا رہے گا ــ اللہ اس کا حامی و مددگار ہو ــ !

گذشتہ شمارے کے ساتھ راقم الحروف کے زیر ادارت 'میثاق' کا ایک سال مکمل ہوگیا تھا۔ اور زیر نظر شمارہ دوسرے سال کا پہلا پرچہ ہے۔ اس کی اشاعت میں بعض موانع کی بنا پر غیر معمولی تاخیر ہوگئی ہے۔ آئندہ اس کی اشاعت میں باقاعدگی پیدا کرنے کے لئے یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ آئندہ اشاعت اگست اور ستمبر دو ماہ کی مشترک ہوگی جو انشاء اللہ قارئین کو یکم ستمبر تک مل جائے گی۔ اس کے بعد کوشش کی جائے گی کہ ہر ماہ پہلی تاریخ کو پرچہ قارئین تک پہنچ جایا کرے۔

السعی منا والاتمام من اللہ

لہٰذا پیش نظر اجتماعیت کی نوعیت ایسی ہونی چاہئے کہ اس میں فرد کی دینی اور اخلاقی تربیت کا کما حقہ لحاظ رکھا جائے اور اسے محض کسی اجتماعی انقلاب کے لئے آلہ کار کی حیثیت نہ دے دی جائے۔ لہٰذا ناگزیر ہوگا کہ پیش نظر اجتماعیت میں اس امر کا خصوصی اہتمام کیا جائے کہ اس کے تمام شرکاء کے دینی جذبات کو جلا حاصل ہو۔ ان کے علم میں مسلسل اضافہ ہوتا رہے۔ ان کے عقائد کی تصحیح و تطہیر ہو۔ عبادات اور اتباع سنت سے ان کا شغف اور ذوق و شوق بڑھتا چلا جائے عملی زندگی میں حلال و حرام کے بارے میں ان کی حس تیز تر اور ان کا عمل زیادہ سے زیادہ مبنی بر تقویٰ ہوتا چلا جائے اور دین کی دعوت و اشاعت اور اس کی نصرت و اقامت کے لئے ان کا جذبہ ترقی کرتا چلا جائے۔ ان تمام امور کے لئے ذہنی اور علمی رہنمائی کے ساتھ ساتھ عملی تربیت اور تاثیر صحبت کے اہتمام کی جانب خصوصی توجہ ناگزیر ہے۔

دعوت کے ضمن میں ہمارے نزدیک ''الدین النصیحۃ'' کی روح اور ''الاقرب فالاقرب'' کی تدریج ضروری ہے لہٰذا دعوت و اصلاح کے عمل کو فرد سے اولاً کنبہ اور خاندان اور پھر تدریجاً ماحول کی جانب بڑھنا چاہئے۔ اس ضمن میں نئی نسل کی دینی تعلیم و تربیت کا خصوصی اہتمام ناگزیر ہے۔

''شہادت حق علی الناس'' کی جو ذمہ داری امت مسلمہ پر بحیثیت مجموعی عائد ہوتی ہے، اس ضمن میں ہمارے نزدیک اہم ترین کام یہ ہے کہ دور جدید کے گمراہ کن افکار و نظریات کا مدلل ابطال کیا جائے اور حیات انسانی کے مختلف پہلوؤں کے لئے قرآن حکیم اور دین متین کی ہدایت و رہنمائی کو وضاحت کے ساتھ پیش کیا جائے۔

مندرجہ بالا رہنما اصولوں کی روشنی میں تفصیلی نقشہ کار کی تعیین اور ایک ہیئت اجتماعی کی تشکیل کے لئے طے کیا جاتا ہے کہ جس قدر جلد ممکن ہو، ہم خیال لوگوں سے رابطہ قائم کیا جائے اور پھر کوئی ایسی صورت اختیار کی جائے کہ ایسے لوگ ایک جگہ جمع ہو کر کسی اجتماعیت کے قیام کی عملی صورت اختیار کر لیں۔

اس کام کی انجام دہی کے لئے فی الحال (شیخ) سلطان احمد (صاحب) کو مامور کیا جاتا ہے۔''

حضرت عائشہ صدیقہ رض	سلام اللہ صدیقی جونپوری	۱٫۰۰ روپیہ
حضرت معاویہ بن ابی سفیان رض	'' '' ''	۱٫۳۰ ''
تاجدار مدینہ کی شہزادیاں	'' '' ''	۱٫۱۵ ''
حضرت عمرو بن العاص	'' '' ''	۲٫۹۰ ''
اہلبیت اور اہلسنت	محمد سراج الحق مچھلی شہری	۱٫۱۵ ''
اسلامی حکومت کے نقش و نگار	مولانا ظفیرالدین مفتاحی	۲٫۰۰ ''
تحفۂ کربلا	محمد احمد الہ آبادی	۰٫۵۰ ''
مولانا مودودی اور سیدنا عثمان غنی رض	محمد سراج الحق مچھلی شہری	۲٫۳۰ ''

دارالاشاعت الاسلامیہ، امرت روڈ، کرشن نگر، لاہور ۱۰